ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۲۴ جون — یکم جولائی ۱۹۷۱ء

غیر اسلامی میلے پر "اسلام پسندوں" کا حملہ

صفحہ — ۴

پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن — ۳½ کروڑ روپیہ کدھر

صفحہ — ۷

سندھ اسپورٹس بورڈ کا جائز فیصلہ اور بوگس تنظیموں کا شور

صفحہ — ۱۷

قیمت: ۵۰ پیسے

ہوائی ڈاک سے: ۶۰ پیسے

شہلا

پینٹنگ

کسی مشہور مصوّر نے بڑی محنت سے
ایک بیمار گداگر کی بنائی تصویر
رنگ دُھندلے تھے مگر نقش بہت کاری تھے
زخم کی ٹیس تھی، کاغذ پہ ہر اِک سادہ لکیر

مضمحل چہرے پہ لکھی تھی کہانی غم کی
نیم وا ہونٹوں پہ فریاد کا ہوتا تھا گماں
متکلّم تھی نگاہوں سے ٹپکتی ہوئی یاس
اور سراپے کی ہر اِک دُکھتی ہوئی رگ تھی عیاں

پیٹ کی آگ سے پگھلے ہوئے اعضاءِ بدن
چیخ اُٹھی تھی لرزتے ہوئے قدموں کی تھکن
ٹھوکریں کھائے ہوئے دل کی سِسکتی آہیں
چشمِ پُر آب میں پنہاں تھیں یہ اندازِ سخن

جب سرِ عام نمائش میں یہ تصویر لگی
دیکھنے والوں نے شہکار اُسے مان لیا
ایک دِل والے نے بڑھ کر اُسے لاکھوں کے عوض
اپنے کمرے کی سجاوٹ کے لئے لے ہی لیا

اور اُسی رات دیا سیٹھ نے کوٹھی پہ ڈنر
تاکہ تعریف ہو کچھ فن کی قدر دانی پر

جام پہ جام چڑھاتے رہے احباب سبھی
موضوعِ سخن آج کا، تصویر رہی

کوئی کہتا تھا نگاہوں کی یہ حسرت ہے غضب
کوئی کہتا تھا مجھے آنکھیں ہیں ویرانیٔ شب

کوئی کہتا تھا اذیت کا تاثر دیکھو
کوئی کہتا تھا، نہیں! ایسے لبیٔ دل دیکھو

کوئی بولا کہ یہ انداز ہے کتنا بھرپور
ہاتھ میں کاسۂ بے رنگ لئے اک معذور

الغرض ہوتا رہا دیر تلک ہنگامہ
لوگ تصویر کی تعریف میں مصروف رہے
ساتھ ہی ساتھ بھرے پیٹوں کی خاطر کیلئے
ماہی و مُرغ پلیٹوں میں سجے آتے رہے

اور اُس شہر کے رونق بھرے اِک رستے پر
آج بھی درد میں ڈوبی یہ صدا آتی ہے
"بھائیو! بھوکا ہوں، معذور ہوں کچھ دے جاؤ"

اداریہ

خُدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ الفتح کراچی

جلد: ۲ شمارہ: ۶

۲۴ جون - یکم جولائی ۱۹۷۱ء

نگران

شوکت صِدّیقی

محمود شام

مدیر

ارشاد راؤ

معاونینِ خصوصی

ابراہیم جلیس - افضل صدیقی

شعبۂ ادارت

وہاب صدیقی، اشرف شاد، نعیم آروی

سرورق کی تصویر: - الطاف رانا

آرٹ

غلام نبی بزمی

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے:	۶۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت: - ۶۰ فلس دوبئی قطر: ۷۵ درم

سعودی عرب: - ۱۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۲ پنس

مقامِ اشاعت

ہفت روزہ الفتح ۸۰ ڈی، نرسری کمرشل ایریا، پی، ای - سی - ایچ - ایس - کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر: ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد - کراچی

اپنے عوام سے اِمداد مانگیے

مشرقی پاکستان کے افسوسناک واقعات سے بھارت نے جو فائدہ اُٹھایا اور عالمی سطح پر پاکستان کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا فوری اثر غیر ملکی اِمداد پر پڑا ہے۔ غیر ملکی اِمداد بحال کرانے، اور بھارتی پراپیگنڈے کا اثر زائل کرنے کے لئے غیر ممالک میں وفد بھیجے جا رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں غیر ممالک کے آگے ہاتھ پھیلانے اور پراپیگنڈے کے مقابلہ میں پراپیگنڈہ کرنے کی بجائے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر اپنے حالات بہتر کریں۔ داخلی طور پر ملک مضبوط ہوگا، پھر غیر ملکی طاقتوں پر پراپیگنڈے کا اثر نہ ہوسکے گا۔ ہمیں بڑے دُکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ غیر یقینی اقتصادی صورتِ حال نتیجہ ہے، ہماری غلط منصوبہ بندی کا، اپنے وسائل کو استعمال نہ کرنے کا، اپنے افراد کی طاقت کو بروئے کار نہ لانے کا، اپنے عوام کی صلاحیتوں، اہلیتوں اور قوت کو نظر انداز کرنے کا۔

اب بھی وقت ہے کہ غیر ملکی طاقتوں سے امداد مانگنے کی بجائے، اپنے عوام سے ہی امداد مانگی جائے۔ اپنی افرادی طاقت کو مکمل طور پر استعمال کیا جائے۔ لاکھوں تعلیم یافتہ اور ان پڑھ افراد بے کار گھوم رہے ہیں اتنا سرمایہ اور اتنی دولت ضائع جارہی ہے۔ چین جس کی دوستی کا دم ہم بہت بھرتے ہیں اس نے بھی غیر ملکی امداد سے بے نیاز ہوکر اتنی محنت کی کہ آج وہ بڑی طاقتوں کی صف میں کھڑا ہے۔ ہمارے پاس وسائل بھی ہیں، عددی طاقت بھی ہے، صلاحیتیں بھی ہیں، اہلیتیں بھی، مگر ہمارے منصوبہ بندی کرنے والے ماہرین، جنھیں سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام کی تربیت حاصل ہے وہ غیر ملکی امداد اور ماہرین کے بغیر کسی منصوبے کا تصوّر ہی نہیں کر سکتے، انھوں نے تعلیمی نظام ایسا بنایا ہے کہ اس سے ہر سال بے روزگار اور قوم کے لئے بے کار بلکہ بوجھ بننے والے لاکھوں افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ کتنا سنگین جرم ہے۔ ہماری درسگاہوں کو ایسی فیکٹریاں بننا چاہیئے جہاں سے نوجوانوں کا خام مال۔ تیارشدہ مال بن کر نکلے، اور قوم کی مشینری میں فوراً فٹ ہوجاتے۔ اگر کوئی ایسا منصوبہ تیار کیا جائے جس کی بدولت اس ملک کے ایک ایک بالغ فرد کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو اس طرح بروئے کار لایا جائے کہ ان کی تمام تر طاقت قوم کی خوشحالی کے لئے استعمال ہو، تو کروڑوں افراد کی روزانہ اور ایک مخصوص سمت میں محنت کا نتیجہ صرف چند ماہ میں برآمد ہوسکتا ہے۔

کاش ہم غیر ملکی طاقتوں کے آگے ہاتھ پھیلانے اور جُھکنے کی بجائے اپنے عوام پر اعتماد کریں اور اُن کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہُوئے اُن سے ہی امداد طلب کریں۔



کراچی میں دُنیا کا آٹھواں عجوبہ

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی غیر اسلامی میلے کا افتتاح کرنے لگے

نمائندہ الفتح

جامعہ کراچی میں ورلڈ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس سروس کے میلے میں ہنگامہ کیوں ہُوا؟ اس کے بارے میں معاصر حریت لکھتا ہے:

"ان طلباء کو اس بات پر اعتراض تھا کہ میلے میں غیر اسلامی حرکتیں ہو رہی ہیں۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ہنگامہ کرنیوالے اسلامی وضع، قطع اور شرعی اصولوں کے پابند تھے یا انہوں نے یہ سب کچھ اسلام کے مقدس نام کی آڑ میں سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے کیا۔

ملاحظہ فرمایئے کہ ہنگامہ کرنے والوں کا حلیہ یہ تھا:
"کالے رنگ کے گاؤن، پتلونیں، بشرٹ یا قمیص، فرنگی کٹ بال، داڑھی مونچھ صاف۔ جن کی داڑھیاں اور مونچھیں تھیں انہوں نے بھی پتلونیں پہنی ہوئی تھیں"
یہ حلیہ فرضی، خیالی یا سُنا سُنایا نہیں۔ سرورق کی تصویر دیکھ لیجئے۔ ثبوت مل جائے گا۔

اب لیجئے، اس پہلو کو جو شیخ الجامعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے میلے کے افتتاح سے متعلق ہے۔ الفتح نے ہمیشہ قریشی صاحب کی "اسلام پسندی" کا پرچار کیا ہے۔ انہیں ملک کے اندر اور غیر ممالک میں سبھی ایک ایسے ماہر تعلیم کی حیثیت سے جانتے ہیں، جنھوں نے اپنے عملی اقدامات، "ذہنی لگاؤ"، ظاہری اور باطنی روابط اور جامعہ میں نافذ کی جانے والی پالیسیوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ وہ "اسلام پسند" ہیں۔ اس کے لئے وہ "جانبدار" بھی کہلاتے۔ مخالفین نے اُن کے خلاف احتجاج بھی کئے، مظاہرے بھی ہوئے، لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف نے ہر موقع پر ثابت قدمی سے کام لیا اور اپنے فیصلوں پر ڈٹے رہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ہنگامہ کرنیوالے ہی وہ نوجوان تھے، جنھیں ڈاکٹر قریشی بہت عزیز ہیں، ان کا بہت احترام کرتے ہیں، ان کی ہر بات نہ صرف مانتے ہیں بلکہ اُن سے بھی اپنی باتیں منواتے ہیں۔ انہیں اُستاد اور شاگرد کے رشتے کا پاس ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں افتتاح کے بعد میلہ اگرچہ غیر اسلامی تھا لیکن پھر بھی واجب الاحترام بن گیا تھا۔ ویسے قریشی صاحب سے غیر تک یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ کسی غیر اسلامی

جامعہ کراچی کے اسلام پسند

امریکہ کی

مخالفت کرنے لگے

محفل کا افتتاح کر کے جامعہ کے "اسلام پسند" طلبہ کو ناراض کر دیں گے۔ ماضی میں تو انہوں نے اپنے طلبہ کے لئے خوشیاں، مسرتیں اور اسی قسم کی دُوسری چیزیں فراہم کی ہیں

اخبارات کی رپورٹنگ، واقعات اور ہنگامے کی وجہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں این ایس ایف کا بالکل ہاتھ نہیں تھا۔ نہ ہنگامے میں اور نہ میلے میں۔ جامعہ کے صدر رمسٹر زاہد حسین بخاری کے بیان نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں:

"طلبہ نے ہنگامے سے پہلے مجھ سے شکایت کی تھی کہ اس میں غیر اسلامی حرکتیں ہو رہی ہیں۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ اُن کے جذبات میلے کے منتظم جناب سلطان چاؤلہ تک پہنچا دوں گا۔ اگرچہ یہ واقعہ افسوسناک ہے لیکن اس کی ذمہ داری میلے کے منتظمین پر عائد ہوتی ہے" اس سے قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون سے طلبہ تھے جن کی صفائی زاہد صاحب پیش کر رہے ہیں۔

"الفتح" یہ بات انتہائی وثوق کے ساتھ کہنے کو تیار ہے کہ اس ہنگامے کا تعلق جامعہ سے صرف اتنا ہے کہ ہنگامہ کرنے والے یہاں پڑھتے بھی ہیں۔ ورنہ فرمان کہیں اور سے ملا ہے اور جس کی رُو سے امریکہ کی مخالفت کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک سیاسی جماعت کے بیمار رہنما نے امریکہ بادشاہ کے خلاف ایک ایسا زنّاٹے دار بیان داغا تھا کہ پاکستان میں امریکہ کے ازلی دُشمن اور اس کی ریشہ دوانیوں پر سے پردہ اُٹھانے والے دم بخود ہو کر رہ گئے تھے۔ سوچ رہے تھے کہ عام انتخابات کے نتائج نے یہ کیا جلوہ دکھا دیا ہے کہ اب یہ بھی امریکہ کی مخالفت کرنے لگے ہیں۔ امداد مُنہ پر مارنے، مال کا بائیکاٹ کرنے اور نجانے کیا کیا فرما رہے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ آخر عوام کو ساتھ ملانے کے لئے امریکہ کی مخالفت اور چین کی دوستی کا اظہار لازمی ہو گیا ہے۔

داؤد نے ۱۳ مارچ کو "پیپل" کو دو صفحی اشتہار کی اِمداد دی

محمودشام

"مشرقی پاکستان میں کیا ہُوا؟" یہ سلسلہ پاکستان کے ماضی قریب کی بعض ایسی داستانوں کو "الفتح" کے قارئین کے سامنے لانے کے لئے شروع کیا گیا ہے جو گذشتہ دنوں بعض ہنگاموں اور مصلحتوں کے باعث شائع نہ ہوسکیں۔ اور ان سے واقعات کا رُخ سمجھنے میں یقیناً مدد ملے گی۔ پاکستان میں بعض حلقے اور پاکستان سے باہر بہت سے حلقے ابھی تک مخلصانہ طور پر یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ ایک عوامی تحریک تھی، جسے طاقت کے زور پر کچل دیا گیا —— حالات و واقعات کے ہر پہلو سے جائزے کے بعد مجھے ایمانداری سے محسوس ہُوا کہ مشرقی پاکستان کے عوام نے اپنے حقوق کے لئے جو تحریک چلائی تھی اُسے شعوری طور پر اور ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت عوام دُشمن اور نسلی امتیاز کی تحریک بناکر ایک سازش میں بدل دیا گیا۔ جس کے باعث مشرقی پاکستان کے عوام کی کمند وہاں ٹوٹی جب کہ لبِ بام دو چار ہاتھ ہی رہ گیا تھا۔ کچھ غیرملکی طاقتوں، کچھ رجعت پسند قوتوں نے مل جُل کر ایسے حالات پیدا کئے کہ فوجی مداخلت کے علاوہ کوئی چارۂ کار ہی نہ رہنے دیا گیا۔ وہ لوگ کون تھے جو داؤد کے طبقے کے خلاف نفرت پھیلانے کی بجائے داؤد کے مزدوروں کو قتل کرنے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ آخر چندر گھونا پیپر مل کے ایک محنت کش سلیمان کا اس کے علاوہ کیا قصور تھا کہ وہ لائل پور کا رہنے والا تھا۔ مَیں نے ایک مہاجر کیمپ میں اُس کے چھوٹے چھوٹے بچوں، اُس کی نوجوان بیٹی، اس کی ستم رسیدہ بیوی کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھی ہیں۔ سلیمان تو اپنی یونین کا بھی سرگرم رکن تھا۔ مزدوروں کے حقوق کے لئے جدوجہد میں ہمیشہ آگے آگے رہتا تھا۔ ایک سلیمان نہیں، ہزاروں سلیمانوں کو نسلی امتیاز کی بھینٹ چڑھانے والے کون لوگ تھے۔ انھیں کس نے اپنے مظلوم بھائیوں کے خون کا ذائقہ چکھایا تھا۔ ساری عوامی تحریک کا ستیاناس کر دیا گیا۔ ایک دو جگہ نہیں پورے مشرقی پاکستان میں یہی کچھ ہو رہا تھا۔ ان پڑھ اور مظلوم بنگالیوں کو مظلوم غیر بنگالیوں سے لڑایا جا رہا تھا۔ تاکہ امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو۔ فوج مداخلت کرے، طاقت استعمال ہو، عوامی جمہوریت، یا عوامی حقوق کے حصول کا سُورج طلوع نہ ہو سکے۔ انھیں اچھی طرح احساس تھا کہ فوج کی مداخلت ہوگی تو اُس کے کیا نتائج ہوں گے: نتائج سامنے ہیں۔ فوج نے یکم مارچ سے ۲۵ مارچ تک اپنی بندوقوں کے دہانے خاموش رکھ کر اور رہم پسندوں کو اپنے بھرپُور اظہار اور انتشار کا موقع دیا۔

یہ کیسی عوامی تحریک تھی اور کیسی مسلّح جد وجہد تھی کہ حریت پسند سڑکوں پہ بندوقوں کے ساتھ مارچ کرتے پھر رہے تھے جو ہتھیار اور طاقت اُن کے پاس تھی، اُسے یہ لوگ ۲۲ مارچ کو ہی میدان میں لے آئے۔ ان ہتھیاروں کا مظاہرہ۔ نہتّے غیر بنگالیوں پر کیا گیا۔ یہ عوامی تحریک یا مسلّح جدوجہد کی کونسی تکنیک تھی۔ یہ تحریک متوسط اور موقع پرست طبقہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا مطمع نظر صرف یہ تھا کہ عوام کا نام لے کر اور اُنھیں قربانی کے لئے پیش کرنے کے بعد انتظار کیا جائے کہ کیا ہوتا ہے۔ "بنگلہ دیش" الگ ہو جائے تو پَو بارہ۔ ورنہ اسی طرح سہی۔ اس تحریک کی قیادت کا بیرومیٹر روزنامہ "پیپل" تھا۔ انگریزی اخبار ہونے کی وجہ سے عام آدمیوں میں تو یہ مقبول نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے بیوروکریٹ اور پڑھا لکھا متوسط طبقہ پڑھتا تھا۔ اور اپنے ذہن کی تعمیر کرتا تھا۔ ۱۱ مارچ کا ایک اور اداریہ ملاحظہ ہو:-

چرچل اور یحییٰ

ایک زیادہ طاقت ور مردِ آہن ونسٹن چرچل نے ایک مرتبہ برّصغیر کے مجاہدین آزادی کو چیلنج کرتے ہُوئے کہا "میں برطانوی اقلیم کا ایسا پہلا وزیرِ اعظم نہیں بنوں گا، جو برطانوی اقلیم کی تباہی پہ صدارت کرے۔" لیکن بہت جلد ہی اُس نے اپنی بھی اور اس کے ساتھ ہی اپنی اقلیم کی، تباہی بھی دیکھ لی۔

کیا صدر یحییٰ بھی اسی مقدر سے دوچار ہوں گے۔ اس کا انحصار صرف انہی پر ہے۔ ماضی میں وہ سلامتی اور اتحاد کے لئے جو مرضی کہتے رہے ہوں، لیکن اب صحیح وقت پہ صحیح قدم ہی بگڑتی ہُوئی صورتِ حال کو بچا سکے گا۔ اب سوال یہ نہیں ہے کہ وہ بنگلہ بندھو کی چار شرائط کو غیر مشروط طور پہ قبول کرے، یا وہ اس تھوڑے بہت کو بچانا چاہتا ہے جو کسی وقت کے خوشحال اور متحد پاکستان میں سے بچ گیا ہے۔ "ہمیں کم سے کم طاقت کے استعمال" کا بتایا گیا ہے۔ لیکن آج پُوری بنگالی قوم بیک آواز اعلان کر رہی ہے "ہمارے کم سے کم مطالبات جو بنگلہ بندھو نے پیش کئے ہیں مان لیں، یا پھر نتائج کے لئے تیار رہیں"

یہ سوچنے کا انداز تھا، ایک خبر جو بکس میں شائع کی گئی، وہ بھی دیکھیئے۔

"چٹاگانگ کی بندرگاہ کے مزدوروں نے مغربی پاکستانی اسلحہ کو اُتارنے سے انکار کر دیا۔ (پی پی آئی)

نیشنل شپنگ کارپوریشن کا ایک جہاز

"چاٹگام کے مزدوروں نے مغربی پاکستان کا اسلحہ اُتارنے سے انکار کر دیا"

ایم وی سوات اسلحہ اور گولہ بارود لے کر گذشتہ روز چاٹگانگ پہنچا۔ لیکن اس سے سامان نہیں اُتارا جا سکا کیوں کہ چاٹگانگ کے مزدوروں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ریلوے حکام نے اس اسلحہ کیلئے جو خالی ویگنیں مہیا کی تھیں وہ بھی ایک جگہ اکٹھی ہوئی ہیں۔ ویگنوں کی حفاظت عوامی لیگ کے رضاکار کر رہے ہیں"

ویگنوں کے ذکر سے مجھے یاد آیا ہے کہ بھارتی مداخلت کار شمالی بنگال کی طرف سے ۹ ڈیزل انجن بھارت لے گئے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے ریلوے رابطے راتوں رات جوڑ کے ٹرینوں کی آمد و رفت بھارت اور مشرقی پاکستان کے درمیان بحال کر دی گئی۔ مجھے یہاں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ موجودہ ہنگاموں سے پہلے بھی ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے کہ بھارت کی ٹرینیں کسی سرحدی ریلوے اسٹیشن تک آتی تھیں۔ ان میں اکثر اوقات اسلحہ لایا جاتا تھا۔ اور ادھر مشرقی پاکستان کی ٹرینیں سرحدی ریلوے اسٹیشن تک غلہ لے کر آتی تھیں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض جگہ ریلوے پٹڑی مشرقی پاکستان میں ہے، اُس کے ساتھ کا علاقہ بھارت میں۔ ایسی جگہوں پر غلے کی اسمگلنگ میں بہت آسانی رہتی تھی۔ چلتی گاڑی ایسے علاقوں میں اچانک آہستہ ہو جاتی ــــ کچھ لوگ ڈبوں کے دروازے کھول کر چاول کی بوریاں نیچے لڑھکا دیتے یہ بوریاں لڑھکتے لڑھکتے سرحد پار کر جاتیں۔ اور "حقداروں" کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔

یہ غلہ بھارت پہنچانے والے اور اپنے بھائیوں کو بھوکا رکھنے والے کون لوگ تھے۔ ہماری انتظامی مشینری کیا کرتی تھی؟ ان سوالات کے جوابات اگر پہلے تلاش کر لئے جاتے تو شاید حالات یہ رُخ اختیار نہ کرتے

یکم مارچ سے ۲۵ مارچ تک "مجیب راج" کے دنوں میں تو کئی سرحدی علاقوں میں بھارتیوں کی عام آمد و رفت رہی۔ بھارتی کرنسی کئی علاقوں میں چلتی رہی بھاشانی صاحب جو کبھی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ۲۰ ہزار گوریلوں کی سنسنی خیز خبر سنا گئے تھے۔ انہوں نے ۱۲ مارچ کو فرمایا:۔

"بنگلہ دیش ۔ پہلے ہی آزادی حاصل کر چکا ہے

اب ہر سطح پر عوامی فوج کی تنظیم کی ضرورت ہے"

یہ میمن سنگھ میں کی گئی تقریر کی سُرخی ہے۔ کیسی آزادی، کیسی عوامی فوج اور کیسے گوریلے۔ کیا انقلاب اخبارات یا عام جلسوں میں تقریروں کے ذریعے آتے ہیں۔ اور کیا حریت پسند اپنی چالیں یوں سب کے سامنے رکھ دیتے ہیں

یہ خبر ۱۳ مارچ کے پیپل میں چھپی تھی۔ اس میں ایک خوش خبری شائع ہوئی ہے۔ اُسے صفحۂ اول کے عین درمیان میں دو کالمی بکس میں نمایاں طور پر حاشیوں میں شائع کیا گیا ہے۔ خبر یہ ہے۔

"امریکی چھوڑ کر نہیں جا رہے ہیں"

واشنگٹن۔ ۱۲ مارچ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے حکام نے بتایا ہے کہ مشرقی پاکستان سے امریکیوں کو نکالنے کا کوئی منصوبہ زیرِ غور نہیں ہے، تاوقتیکہ، وہاں بحران اور تشدد زیادہ سنگین صورت اختیار نہ کر جائیں

حکام نے بتایا کہ کسی انتہائی ہنگامی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لئے تو تیاریاں کی جا رہی ہیں لیکن موجودہ حالات میں امریکیوں کی نقلِ مکانی کا حکم

چلتی ٹرین سے

غلّہ بھارت میں

پھینک دیا جاتا

جاری کرنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

انہوں نے اس رپورٹ کی خاص طور پر تردید کی کہ مشرقی پاکستان سے امریکی شہریوں کو اس ہفتے کے آخر میں نکال لینے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ (رائٹر)

اس معمولی سی خبر کو اتنی اہمیت کے ساتھ اور صفحۂ اوّل کے درمیان بکس کی صورت میں چھاپنے سے بھی اس تحریک کے رُخ کا اندازہ لگ سکتا ہے، کیونکہ پیپل عوامی لیگ کا اصل ترجمان بنا ہوا تھا۔

اس اثنا میں جناب خان عبدالولی خان ڈھاکہ پہنچ جاتے ہیں۔ اور مجیب الرحمان کے اُن مطالبات کی حمایت کا اعلان کر دیتے ہیں جن میں مارشل لاء اُٹھائے جانے اور اقتدار کی فوری منتقلی مانگی گئی تھی۔

داؤد کا دو صفحات کا عطیہ

جب پورے ملک کی اقتصادی حالت دگرگوں ہے، کارخانوں میں پیداوار بند ہے۔ مشرقی پاکستان میں خاص طور پر حالت غیر یقینی ہے۔ بنکوں سے ایک ہزار سے زیادہ رقم نہیں نکلوائی جا سکتی۔ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستانیوں کے استحصال کے خلاف آگ پھیلی ہوئی ہے۔ اس وقت پیپل میں داؤد ہرکلیس کیمیکلز لمیٹڈ کا دو صفحات کا پراسپکٹس شائع ہوتا ہے۔ دو صفحات کا اشتہار پراسپکٹس ان دنوں میں چھپتا ہے جب تجارت یا پیداوار کی کوئی گنجائش موجود ہو۔ تمام کاروبار ٹھپ ہو چکے ہیں مگر داؤد صاحب دو صفحات کا پراسپکٹس چھپنے کو دے رہے ہیں۔ وہ بھی پیپل کو۔ دو صفحات کا کتنا روپیہ بنتا ہے۔ اور ان دو صفحات کے اشتہار دینے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی داؤد صاحب سے پوچھے۔ اور "پیپل" سے بھی پوچھے کہ جن لوگوں کے تسلط سے آپ بنگالیوں کو نجات دلا رہے ہیں، اُن کے دو صفحات اور وہ بھی پراسپکٹس کے شائع کرا کے آخر کس پودے کی آبیاری کر رہے ہیں۔ دو صفحات کا اشتہار دینے والا بنگالیوں کا استحصال کر رہا یا اُس کے پیپر مل میں کام کرنے والا مزدور۔ بنگالیوں کا استحصال کر رہا تھا۔

اسی روز کے پرچے میں طلبہ کی ایک تصویر چھاپی گئی ہے جس میں وہ دفاعی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ اس میں ایک خبر ہے

"تاجہ مجیب کے ساتھ ہیں"۔

اس میں ایک خبر یہ ہے:

"پاکستان کلچرل اکیڈیمی کا نام بدل کر بنگلہ سنسکرتی اکیڈمی رکھ دیا گیا۔

پردہ چاک



اس کارپوریشن نے فینسی کے ڈوبتے بنک کو نئی زندگی دیدی

پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن

۳۵۰۰۰۰۰۰ — روپے کدھر — ہے

وقائع نگار خصوصی

ہوٹل میٹرول کی پہلی منزل پر اُلٹے ہاتھ چلے جائیے۔ جہاں ایک سفید وردی میں چپراسی آپ کا راستہ روکے۔ وہاں سے اُلٹے قدموں لوٹ آئیے۔ کیونکہ ان کمروں کے اندر جانے سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس میں عام لوگوں کا ابھی کوئی حصّہ نہیں ہے۔ یہ کمرے ۲۲ خاندانوں میں سے ایک فینسی خاندان کے زیر انتظام ہیں سرمایہ حکومتِ پاکستان کا ہے اور کام ابھی کاغذوں میں گردش کر رہا ہے۔ کیونکہ ابھی ایک کروڑ کے شیئرز فروخت نہیں ہوئے البتہ حکومت سے نرم شرطوں پر ۲ کروڑ روپے کا قرض لیا جا چکا ہے۔

یہ ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی ہے جو مارچ ۱۹۷۰ء میں رجسٹرڈ ہوئی۔ اس کے ڈائریکٹرز بے چارے اتنے بے اثر ہیں کہ اب تک ایک کروڑ روپے کے شیئرز فروخت نہیں کر سکے لیکن حکومت پر اُن کا اتنا اثر ہے کہ انہوں نے مئی ۱۹۷۰ء میں حکومت سے اس کے شیئر کے طور پر ۲۵ لاکھ روپے وصول کر لئے۔ اور بعد میں حکومت سے نرم شرائط پر ۲ کروڑ روپیہ بھی بطور قرض لے لیا۔ اس کے علاوہ بھی سرکاری محکمۂ سیاحت کی ملکیت، لگژری کوچیں، لگژری لانچیں، ایئرکنڈیشنڈ ٹورسٹ وین اور نہایت نفیس فرنیچر والے ٹورسٹ ریسٹ ہاؤس، ساحلی قیام گاہیں بھی اس کو ترکے میں ملی ہیں۔ اس کے علاوہ قیمتی تشہیری سامان، جس میں کیمرے، فلم پروجیکٹر، قیمتی ٹرانسپیرنسیاں اور متحرک فلمیں شامل ہیں۔ یہ سب کچھ بھی ایک کروڑ روپے سے زیادہ کی مالیت کا ہے۔

اس کروڑوں روپے کے سامان اور کروڑوں روپے کی مالک پاکستان ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن ہے۔ یہ کارپوریشن پاکستان میں سیاحت کے فروغ کے لئے قائم کی گئی ہے۔ مکمل طور پر سرکاری محکمۂ سیاحت ختم کر کے پاکستان میں سیاحت کے ذریعے زرمبادلہ کمانے کے لئے پبلک کارپوریشن قائم کی گئی۔ اس ادارے کے انتظامی امور پر اگرچہ یکے از ۲۲ خاندان قابض ہو گیا ہے مگر اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت ہی اُٹھائے ہوتے ہے۔ قرضوں اور شیئر کے علاوہ اندرونِ ملک تمام تر سہولتیں سرکار نے دی ہیں۔ اور اب بیرونِ ملک پاکستان کے ہر سفارت خانے کے ساتھ سیاحتی سیل قائم کئے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی اور پبلک ادارے کو ایسی سرکاری سہولتیں کیسے میسّر ہو سکتی ہیں۔

گذشتہ ایک برس میں اس ادارے میں جتنی کاغذی کارروائی ہوئی ہے اس سے سیاحت کے فروغ کا تو کوئی ثبوت نہیں ملتا البتہ فینسی خاندان کو کروڑوں روپے کا فروغ ہوا ہے۔ پاکستان ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کو اس خاندان نے ایک صنعتی کارخانہ بنا کر رکھ دیا ہے جس طرح بڑے صنعت کار اپنا سرمایہ لگائے بغیر حکومت کے قرضوں اور دوسروں کے شیئرز پر ہی مِل چلاتے ہیں اور نفع اپنے گھر ڈالتے رہتے ہیں کچھ یہی حال اس کارپوریشن کا ہو گیا ہے۔ فینسی خاندان نے اب تک اس کارپوریشن میں اپنا کوئی پیسہ صرف نہیں کیا لیکن حکومت سے وہ متواتر سرمایہ وصول کئے جا رہے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے۔

تمام فینسی خاندان کا

پیسہ —

حکومتِ پاکستان کا

۱۔	حکومت کا شیئر	۲۵ لاکھ
۲۔	حکومت سے قرض	۲ کروڑ
۳۔	محکمہ سیاحت کا سامان	ایک کروڑ
۴۔	محکمہ سیاحت کی پبلسٹی گرانٹ	۲۵ لاکھ
۵۔	بجٹ گرانٹ	

فینسی خاندان نے دانش مند صنعتکار کی حیثیت سے حکومتِ پاکستان سے مختلف مدوں میں روپیہ وصول کیا۔ اب سرمایہ کاری میں حکومت کا حِصّہ تقریباً ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ ہے۔ چیئرمین اور فینسی خاندان نے اب تک خود کتنی سرمایہ کاری کی، کاغذات اس کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔

یہ ایک الگ بات ہے کہ یہ سارا سرکاری سرمایہ عوام سے وصول کئے گئے ٹیکسوں پر مشتمل ہے۔ اور اس بات کا سرکار نے کوئی انتظام نہیں کیا کہ کارپوریشن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ہاتھوں اس کے صحیح استعمال کی ضمانت دی جا سکے۔ عوام کے گاڑھے خون پسینہ کی کمائی سے کارپوریشن کے افسروں کے کمرے آراستہ کئے جا رہے ہیں۔ افسر مشرقی، مغربی پاکستان اور بیرونِ ملک دوروں پر جا رہے ہیں — "مہمان نوازی" کے حساب میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جا رہی ہیں — یہ عجیب بات ہے کہ مارچ ۱۹۷۰ء سے اب تک پندرہ ماہ گذر چکے ہیں لیکن فینسی گروپ اب تک کارپوریشن کے شیئرز عوام میں فروخت کے لئے پیش نہیں کر سکے، بلکہ

سرمایہ دارانہ ہتھکنڈوں کے ذریعے لاکھوں روپے کا ہیر پھیر

اخبارات میں ایسی خبریں بھی دیکھنے میں آئی ہیں کہ کارپوریشن کو حکومت کی طرف سے جو املاک ملی تھیں اُن کی بھی حفاظت نہیں ہو سکی ہے اور وہ مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے زبوں حال ہیں۔ عوام کی محنت سے کمائے ہُوئے سرمائے کے ضیاع کی ذمہ داری کس پر ہوگی ؟

پاکستان میں آنے والے سیاحوں کی تعداد اور زرِ مبادلہ میں اضافہ تو کیا ہوتا مسٹر فیلسی کے بیرونِ ملک دَوروں میں خوب اضافہ ہوگیا۔ فیلسی صاحب نے کارپوریشن کے دفاتر کھولنے کے سلسلے میں بات چیت کرنے کے لئے ذاتی طور پر امریکہ اور یورپ کے دَورے کئے ہیں۔ آجکل امریکہ افراطِ زر سے دوچار ہے۔ یورپ کے بنکوں کی حالت ان دنوں یہ ہے کہ وہ صرف ایک برس کے ڈپازٹ پر آٹھ سے نو فیصد تک کا سود دے رہے ہیں۔ فیلسی گروپ نے تو پاکستان کی حکومت سے ۲۰ برس کے لئے سُود کے بغیر یا برائے نام سُود پر ۲ کروڑ روپیہ قرضہ مانگا ہے۔ اپنے ملک میں انھیں اس قرض پر سُود بھی نہیں دینا پڑے گا۔ اُدھر دُوسرے ممالک میں صرف ایک برس کے ڈپازٹ پر آٹھ سے ۹ فیصد تک سُود مِل جائے گا۔ کتنے منافع کا سَودا ہے۔ پاکستان کے بیچارے غریب عوام کو کیا معلوم کہ اُن کے ساتھ کیا کیا ڈرامے کھیلے جا رہے ہیں۔

لگژری گاڑیوں کے لئے نقد لائسنس

ایسے وقت میں جب کہ عوام پر مزید ٹیکسوں کا بوجھ پڑنے والا ہے۔ قوم بنیادی سہولتوں سے بھی محروم ہے ایسے میں اگر فیلسی گروپ کو دیئے جانیوالے ۲ کروڑ روپے پاکستان کے کسی بنک میں رہتے تو اس پر سُود سے ہی قریباً ۱۸ لاکھ روپے سالانہ نکل سکتے تھے۔ ان سے حکومت آسانی سے اپنے سفارت خانوں میں سیاحت کے فروغ کے لئے شعبے قائم کر سکتی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ۲ کروڑ روپے کیسے منظور کیے جا رہے ہیں۔

اس پر بس نہیں، مسٹر فیلسی نے حکومت سے لگژری گاڑیاں درآمد کرنے کے لئے "نقد لائسنس" کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ ملک پر دفاعی اخراجات کا بوجھ بڑھ رہا ہے۔ فیلسی صاحب اتنی زحمت بھی نہیں کر سکتے کہ حکومت سے نقد لائسنس لینے کے بجائے خود سرمایہ کاری کریں اور یہ گاڑیاں برآمد کریں۔

اشتہارات کا خرچ

محکمۂ سیاحت نے گذشتہ دس برس میں سیاحت کے فروغ اور تشہیر پر ۱۰ لاکھ سالانہ سے زیادہ خرچ نہیں کیا۔ ہمارے نزدیک یہ رقم بھی ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔ زرمبادلہ کا کل خرچ اڑھائی سے تین لاکھ سالانہ تھا۔ لیکن فیلسی گروپ نے اس پرائیویٹ سیکٹر کی کمپنی کی صرف پہلے سال کی تشہیر کے لئے غیر ملکی زرمبادلہ میں ۲۲ لاکھ روپیہ مختص کیا ہے۔ محکمہ سیاحت اور موجودہ کارپوریشن کے بجٹ میں کسقدر فرق ہے تشہیر کے لئے مخصوص یہ رقم کہاں اور کیسے صرف ہوتی یا ہوگی۔ اس کا حساب کون لے گا ؟

کارپوریشن کا مجلہ

پاکستان ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن نے اپنا سہ ماہی مجلّہ "فوکس اون پاکستان" بڑے اہتمام کے ساتھ پانچ ہزار کی تعداد میں شائع کیا۔ اس کی قیمت دس روپیہ رکھی گئی تھی۔ اس پر خرچ کا اندازہ اس کی قیمت سے کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں سے کارپوریشن ۴۰۰ سے زیادہ جلدیں فروخت نہیں کر سکی۔ باقی ۴۶۰۰ پرچے یونہی ضائع ہو رہے ہیں۔ اس میں حکومت کی لگائی ہُوئی رقم کا جو ضیاع ہُوا۔ کیا اس کا حساب کتاب لیا گیا۔

لگژری کوچوں کی حالت

کارپوریشن کو محکمہ سیاحت سے جو لگژری گاڑیاں ملی تھیں۔ اُن سے عوام کو جو شکایات ہیں وہ کئی بار اخبارات کے ذریعے سامنے آچکی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ کارپوریشن ان گاڑیوں کی حالت برقرار نہیں رکھ سکی۔ تو ان گاڑیوں کی حفاظت کیسے کرے گی۔ جو وہ مزید برآمد کرنا چاہتی ہے۔

اکاؤنٹ کامرس بنک میں

سنا گیا ہے کہ کارپوریشن کا اکاؤنٹ کامرس بنک میں کھولا گیا ہے۔ کیونکہ وہ فیلسی کا اپنا بنک ہے۔ اس بنک کی بنکاری کی دنیا میں جو ساکھ ہے اس سے سبھی لوگ واقف ہیں۔ اگر دو کروڑ روپے کی رقم کسی بھی دُوسرے بنک میں رکھی جاتی تو کارپوریشن کو کم از کم چھ فیصد سُود بھی مل سکتا تھا۔ بنکوں کا دستور ہے کہ ایک لاکھ کے ڈپازٹ پر سالانہ چھ فی صد سُود دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دُوسری سہولتیں بھی دی جاتی ہیں۔ اس طرح کارپوریشن کو جو آمدنی ہوتی اس سے تشہیر کا خرچ بآسانی نکل سکتا تھا۔ بنک عام طور پر سود پیشگی بھی دیتے ہیں۔ لیکن سرمایہ داروں کے ہتھکنڈے سے کام لیتے ہُوئے حکومت سے دو کروڑ روپیہ قرض لیا گیا۔ اس کے علاوہ مختلف گرانٹوں کی شکل میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ۔ اور اسے کامرس بنک میں جمع کروا دیا گیا۔ تشہیر کے لئے رقم الگ سے حاصل کر لی گئی۔ یوں کارپوریشن کے ذریعے فیلسی گروپ اپنے ڈوبتے ہُوئے بنک کو بچانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ سُود بھی نہ دینا پڑا۔

اپنا ٹریول ایجنٹ بھی

کارپوریشن نے اپنا ایک ذیلی ادارہ "پاکستان ٹریولز" بھی قائم کر دیا ہے جس کا براہِ راست مقابلہ دوسرے ٹریول ایجنٹوں سے ہے۔ پرانے ٹریول ایجنٹ، جنھوں نے ذاتی سرمائے سے اپنے کاروبار کو فروغ دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ سیاحت کو بھی۔ ان میں سے بیشتر کے ایجنٹ اور نمائندے دُوسرے ممالک میں بھی ہیں۔ "پاکستان ٹریولز" چونکہ کارپوریشن کا ذیلی ادارہ ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ کارپوریشن اس کو سہولتیں فراہم کرے گی اور دُوسرے منظور شدہ اور قدیم ٹریول ایجنٹ ان سہولتوں سے بھی محروم ہو گئے ہیں جو پہلے انھیں محکمۂ سیاحت سے مل جاتی تھیں۔ اس میں پاکستان کی سیاحت کا تشہیری لٹریچر بھی شامل ہے۔

یہ ۲۲ خاندانوں میں سے ایک کی نئی اجارہ داری کی داستان ہے۔ پاکستان کے ایک قدیم ٹریول آپریٹر ڈاکٹر اے لطیف فاروقی نے صدرِ پاکستان سے اپیل کی ہے کہ کارپوریشن کے عیاشانہ اخراجات کے سلسلے میں اعلیٰ سطحی تحقیقات ہونی چاہئیں۔ کیونکہ سرکاری سرمایہ جو عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ اس کا احتساب کرنے والا کوئی نہیں ہے، سیاحت کے فروغ کی بجائے فیلسیوں کا فروغ ہو رہا ہے۔

الفتح

چپراسی

اپنے بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کیلئے رات کو پان سگریٹ بیچتا ہوں

کلاس ون آفیسر

اخراجات پورے کرنے کے بعد بھی چار یا پانچسو بچ جاتے ہیں

لوئر ڈویژن کلرک

میرے بجٹ میں سبزی گوشت اور پھل کا نشان نہیں ملے گا

ن - الف

بابو خان تغلق ہاؤس کے ایک سرکاری دفتر میں چپراسی ہے۔ تغلق ہاؤس کی صاف ستھری اور بڑی سی عمارت میں اُس کا میلا سا وجود کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی ملگجی داڑھی کے سارے بال پیلے ہو چکے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ہر وقت پانی بہتا رہتا ہے۔ جسے وہ بار بار اپنے میلے دامن سے صاف کر کے زور زور سے کھانسنے لگتا ہے" اوہو ہو' یہ ظالم کھانسی تو جان لے کر چھوڑے گی" گفتگو کے دوران اس جملے کو وہ دہراتا جائیگا۔ یہاں تک کہ آپ اُٹھ کر چل دیں گے کہ کہیں وہ آپ کے سامنے ہی نہ دم توڑ دے۔ وہ دِق کا رہنے والا ہے۔ تقسیم کے وقت جب اس کی مرضی معلوم کی گئی تو اُس نے سینہ پھُلا کر کہا "پاکستان جاؤں گا۔ پاکستان - اپنے وطن" اس طرح اُس کی ملازمت' اس کے ساتھ ہی پاکستان منتقل ہو گئی۔ اب وہ اپنی ملازمت کے آخری سال میں ہے۔ کل کیا ہوگا' اسے خود معلوم نہیں۔ "خدا نے جیسے اتنے دن کاٹ دیئے ہیں، آنے والے دن بھی عزت سے گزر جائیں گے"

بابو خاں چپراسی کی بنیادی تنخواہ ۶۵ روپے ہے۔ ایک سال میں ایک روپیہ کا انکریمنٹ ملتا ہے۔ کراچی الاؤنس ۵ روپے، کوارٹر کا کرایہ ۵ روپے۔ آمد و رفت کا کرایہ ۱۵ روپے اور عبوری امداد کے نام پر اُسے ۱۲ روپے دیئے جاتے ہیں۔ چونکہ اُس کی ملازمت خاصی پرانی ہو چکی ہے اس لئے تمام کٹوتی کے بعد سالانہ اضافہ اور دوسرے الاؤنس ملا کر اُسے کل ۱۳۵ روپے ملتے ہیں۔ اس کے پانچ بچے ہیں، ایک بیوی، اس طرح اُس کے خاندان میں اُسے ملا کر سات افراد ہیں۔

اس نے میرا سوال سُن کر کہا "بابو گھر کے اخراجات کے لئے بجٹ کیسے بنایا جاتا ہے، اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے جو کچھ ملتا ہے اُسے گھر پر ہی خرچ کرتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اتنے پیسوں میں گھر کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ شام کو محلے میں پان اور سگریٹ بیچتا ہوں۔ پھر بھی خرچ پورا نہیں ہوتا۔ بچے لکھنے پڑھنے کے قابل ہیں لیکن اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ مجبوری ہے، کیا کروں۔ سارا دن محنت کرنے کے بعد بھی دال روٹی کا بندوبست مشکل سے ہوتا ہے ـــــ"

بابو خاں نے بتایا، اس کی کل ماہانہ آمدنی ۱۳۵ روپے ہے لیکن ہر ماہ کبھی ڈیڑھ سو اور کبھی دو سو روپے تک خرچ ہوتے ہیں۔ فاضل اخراجات پورے کرنے کے لئے فاضل محنت کرنی پڑتی ہے۔ پھر بھی کام نہیں چلتا، چیزوں پر ہوش ربا گرانی بڑھتی جا رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مہنگائی کہاں جا کر ٹھہرے گی۔ کس طرح سے گزر بسر ہوگی۔ بقیہ عمر عزت سے گزرے گی یا بھیک پر گذارا کرنا ہوگا اور پھر بھیک بھی کون دے گا۔ سب کا پیٹ خالی ہوگا۔"

بابو خاں گھریلو بجٹ کے نام پر جھنجلا گیا۔ اس نے کہا "میں بجٹ کے چکر میں کبھی نہیں پڑا۔ جو کچھ محنت سے کمایا، ایمانداری سے بال بچوں پر خرچ کر دیا۔ سگریٹ تک پینا چھوڑ دیا۔ اور سَو کی بات ایک ہے۔ ہماری تنخواہ کا اسکیل بنانے والوں کو اسی تنخواہ پر دو ماہ گزارا کرنے کو کہا جاتے تو انہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا ـــ"

الفتح
کراچی

نے مختلف آمدنی والے طبقوں کے بارے میں یہ جاننے کے لئے کہ وہ زندگی کی گاڑی کیسے کھینچ رہے ہیں یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ گذشتہ ہفتے ایک تلعی گر اب کے ایک چپراسی، افسر اور کلرک کی آمدنی اور اخراجات دیئے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ ہم جاری رکھنا چاہتے ہیں تاکہ عام آدمی کی اقتصادی اُلجھنیں سامنے آتی رہیں۔ آپ بھی اپنے گھر کا بجٹ ہمیں بھجوایئے

(ادارہ)

کلاس ون آفیسر

چپراسی سے چٹ اندر بھجوائی، پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ معلوم ہوا صاحب کا ایک شناسا آگیا ہے، چائے کا دور چل رہا ہے۔ پرانی باتوں کا ذکر چھڑ گیا ہے۔ بہر حال پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد میری اندر طلبی ہوئی۔ چپراسی نے مسکرا کر کہا "صاحب آپ خوش قسمت

ہیں، یہاں تو گھنٹوں انتظار کے بعد بھی واپس جانا پڑ جاتا ہے" کمرہ ایر کنڈیشنڈ تھا، زمین پر قالین بچھی ہوئی تھی بڑی سی صاف ستھری میز پر کاغذ، قلمدان اور پیپر ویٹ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ اسکرین سے کمرے کا پارٹیشن کیا گیا تھا۔ دوسری طرف آرام دہ صوفے پڑے تھے درمیان میں شیشے کی ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ جس پر

ایک چپراسی کی تنخواہ

بنیادی تنخواہ	۶۵ روپے
سالانہ اضافہ	۱ روپیہ
کراچی الاؤنس	۵ روپے
کوارٹر الاؤنس	۵ روپے
کرایہ آمدورفت	۱۵ روپے
عارضی امداد	۱۳ روپے
کل تنخواہ	**۱۰۴ روپے**

کلاس ون افسر (جونیئر اسکیل)

۴۵۰ — ۵۰ — ۱۰۰۰

کلاس ون افسر (سینئر اسکیل)

۷۵۰ — ۵۰ — ۱۶۰۰

جونیئر ایڈمنسٹریٹو اسکیل

۱۴۰۰ — ۵۰ — ۱۸۰۰

سینئر ایڈمنسٹریٹو اسکیل

۲۰۰۰ — ۱۰۰ — ۲۲۰۰

نوٹ: کلاس ون افسر کا سالانہ اضافہ کم سے کم ۵۰ روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ روپیہ ہے جب کہ ایک چپراسی کا سالانہ اضافہ صرف ایک روپیہ ہے۔

ایک چپراسی کی تنخواہ — ۱۲۵ روپے
ایک کلرک کی تنخواہ — ۱۰۵ روپے
ایک افسر کی تنخواہ — دو ہزار روپے

کلرک اور چپراسی کا گھریلو بجٹ خسارے میں جاتا ہے جب کہ افسر موصوف کا فاضل بجٹ ہوتا ہے۔

قہوے کی پیالیاں پڑی تھیں۔ میں نے جب اپنا مقصد بیان کیا تو موصوف نے افسرانہ مسکراہٹ سے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا تعلق انکم ٹیکس سے تو نہیں؟"

یہ صاحب جن سے میں مل رہا ہوں، ایک سرکاری دفتر میں کلاس ون افسر ہیں۔ سینئر ایڈمنسٹریٹو اسکیل کے مطابق تنخواہ پاتے ہیں۔ کار، کوٹھی بنگلہ، غرض کہ انھیں ہر قسم کی سہولت میسر ہے۔ اُن کے بچے انگلش میڈیم اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ بچوں کا مستقبل بھی روشن ہے۔ عام طور پر سی ایس ایس اور سی ایس پی کے امتحانات میں ایسے ہی بچے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس طرح فارن اور سول سروس کے اعلیٰ عُہدے ہمیشہ ایسے ہی گھروں کے ہونہار بچوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ باہر نکل کر کہیں نہیں جاتے۔ یہ صاحب اپنے چہرے مُہرے عادات و اطوار سے خاصے "سوبر" اور ہشاش بشاش دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے کوشش کی کہ کسی طرح اُن کے چہرے کے تاثرات انور سعید کلرک اور بابو خان چپراسی سے مل جائیں۔ مگر ناکامی ہوئی۔

میرے سوال کے جواب میں کہا "اس سوال کا بہتر جواب میری بیگم یا میرے گھر کا ذاتی ملازم دے سکتا ہے۔ کیوں کہ گھر کے سارے اخراجات کی ذمہ داری انہی لوگوں کے سپرد ہے"۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا اسکیل —— ۲۰۰۰ — ۱۰۰ — ۲۲۰۰ یعنی سو روپے سالانہ انکریمنٹ ہے۔ سالانہ انکریمنٹ پر میرے ذہن میں بابو خان کا چہرہ گھوم گیا۔ ایک روپیہ سالانہ انکریمنٹ۔ انور سعید بھی نظر آیا۔ پانچ روپے سالانہ انکریمنٹ "بہرحال روپے" جی ہاں۔ زندگی کے بہت سارے دن کٹ گئے، بقیہ بھی کسی نہ کسی طرح کاٹ ہی لوں گا"۔

صاحب نے بتایا کہ سارے الاؤنس وغیرہ ملاکر ان کی تنخواہ تقریباً دو ہزار ہے۔ گفتگو کے دوران مجھے احساس ہُوا کہ وہ اپنی بیگم سے نالاں ہیں۔ پتا چلا کہ ان کی بیگم ہر ماہ ان کا جیب خرچ کم کر کے بنک میں رقم جمع کرتی ہیں بُرے وقتوں کے لئے۔ معلوم ہُوا کہ بیگم صاحبہ ہر ماہ کم سے کم تین سو روپے سے لے کر پانچ سو روپے تک پس انداز کرتی ہیں۔ میں نے اُن کے جیب خرچ کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا کہ صرف کلب کی تفریحات پہ ہر ماہ تین سو روپے خرچ ہوتے ہیں۔ سگریٹ، قہوہ، سینما کا خرچ الگ رہا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے خرچ ہیں جن پر "ٹاپ پرائرٹی" اور "ٹاپ سیکرٹ" کا لیبل چسپاں ہوتا ہے۔ موصوف معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گئے۔

انہیں کبھی تنگی کی شکایت نہیں رہی، اور تنگی کا احساس بھی کیسے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اندر ساری خوبیاں یکجا کر دی ہیں۔ ایسی خوبیوں والے لوگ بھوکے نہیں مرتے۔ اور نہ ہی اُنھیں کبھی زندگی میں تنگی ستاتی ہے۔ ہمیشہ خوش و خرم اور بھلے چنگے رہتے ہیں۔ اشیائے صرف کی قیمتیں خواہ کتنی بڑھ جائیں اُن کا گھریلو بجٹ خسارے میں نہیں جاتا۔ ہر ماہ سارے اخراجات پُورے کرنے کے بعد بھی چار پانچ سو روپے بچ جاتے ہیں۔

لوئر ڈویژن کلرک

مشہور محل کی نیم تاریک سیڑھیاں طے کر کے جب میں اُس کے برانچ میں پہنچا تو معلوم ہُوا کہ ایک روز قبل اُس کا ٹرانسفر کر دیا گیا ہے۔ اچانک تبادلے کی وجہ بڑے بابو کی ناراضگی بتائی گئی۔ اُس کا نیا سیکشن تیسری منزل پر تھا۔ پُورے کمرے میں ایک پنکھا دمے کے پرانے مریض کی طرح کراہ رہا تھا۔ دیوار کی بلندی پر ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس میں سے مدھم مدھم روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اُس کی میز پہ فائلوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ۱۰ سال سے فائلوں کے ڈھیر میں رہتے ہوئے اس کا وجود بھی ایک پرانی فائل کی طرح نظر آرہا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اپنے بھاری شیشوں کی عینک کو دامن سے صاف کرتے ہوئے اُس نے کہا: "آیئے، میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔" جب میں نے اُس سے اپنا مدعا بیان کیا تو بڑی تلخی سے ہنستے ہُوئے بولا۔ "اجی جناب ہماری کیا بساط کہ ہم بجٹ بنا کر سلیقے سے اپنے گھر کا خرچ پُورا کریں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ ہر ماہ تنخواہ کی صُورت میں جو کچھ ملتا ہے اس سے کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو جاتا ہے۔ ناگہانی آفت کے تحت اگر پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تو کہیں سے قرض کا انتظام کر لیا۔ اگر قرض نہ ملا تو گھر کی کوئی چیز فروخت کر دی اور اب تو گھر میں بھی کوئی چیز باقی نہیں رہی جسے فروخت کر کے اپنی کسی ضرورت کو پُورا کر سکوں۔ گاڑی چل رہی ہے۔ کسی نہ کسی طرح جیتے تک سانس ہے کھینچتا ہی رہوں گا۔"

میرے اصرار پر کمپٹرولر سندھ کے کلرک انور سعید نے بتایا کہ اُس کی سروس کی مدت ۵ سال سے زیادہ ہوگئی ہے وہ لوئر ڈویژن کلرک ہے۔ ہر ماہ تمام کٹوتی کے بعد

باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیں

کینیڈی خاندان نے جانسن کو خصوصی طیارے میں بیٹھنے نہ دیا



——— : الفتح فیچر ———

امریکہ کے صدر جان ایف کینیڈی کو قتل کر دیا گیا۔ پورے امریکہ میں تہلکہ مچ گیا۔ قتل کے واقعہ سے کچھ دیر بعد صدر کینیڈی کی لاش ایئر فورس کے ایک خصوصی طیارے میں واشنگٹن لائی گئی۔ نائب صدر جانسن ٹیکساس ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ وہ اس اسپیشل طیارے میں کینیڈی خاندان کے ساتھ واشنگٹن پہنچنے کے خواہش مند تھے۔ اُنھیں اس کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ وہ جُونہی طیارے کی طرف بڑھے، رابرٹ کینیڈی نے آگے بڑھ کر انہیں ایک زوردار دھکا دیا۔ اور قائمقام صدر کو طیارے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اس طرح کینیڈی خاندان نے اپنے طرزِ عمل سے امریکی عوام پر یہ بات ظاہر کر دی کہ جانسن اُن کے نزدیک ناپسندیدہ شخص ہیں۔ جانسن کے لئے یہ چرکہ ناقابلِ برداشت اور انتہائی اذیت ناک تھا۔

کینیڈی خاندان جانسن کو کیوں ناپسند کرتا تھا، اِس کے پیچھے ایک داستان ہے، اقتدار کی کش مکش کی داستان۔ جان ایف کینیڈی جس زمانے میں صدر کے انتخابات لڑ رہے تھے، اُن کے چھوٹے بھائی باب کینیڈی نائب صدر کے عہدے پر آنا چاہتے تھے۔ جب کہ اُسی عہدے کے لئے اُن کے طاقتور حریف لنڈن بی جانسن بھی گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ جان کینیڈی کو جانسن کی طاقت اور اثر کا پُورا اندازہ تھا وہ دل سے اس بات کو چاہتے تھے کہ نائب صدر کے لئے کوئی اپنا آدمی ہو جس پر وہ آنکھ بند کر کے اعتماد کر سکیں۔ امریکی طرزِ حکومت میں نائب صدر کا عُہدہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ صدر کی عدم موجودگی میں نائب صدر پوری انتظامی مشینری کا سب سے اہم اور اعلیٰ پرزہ بن جاتا ہے۔ صدر کی علالت یا اس کی طویل چھٹی سے فائدہ اٹھا کر اُس کے خلاف سازشوں کا جال بُن سکتا ہے۔ کینیڈی کی دلی خواہش تھی کہ نائب صدر کے عُہدے کے لئے اُن کا بھائی باب کینیڈی ہی منتخب کیا جائے۔ مگر وہ جانسن کے معقول اثر سے خائف تھے۔ اُنھیں جب اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ جانسن نظر انداز کئے جانے کے بعد اُن کے ایک خطرناک حریف بن سکتے ہیں تو بحالتِ مجبوری انہوں نے کنونشن کو ہدایت کر دی کہ لنڈن جانسن کو نائب صدر نامزد کیا جائے۔ اُن کے اس فیصلے سے بہت سے لوگوں کا دل خون ہو گیا۔

چار سال قبل جب لنڈن بی جانسن کو دوبارہ نائب صدر منتخب کیا گیا تو اُن کی پارٹی کے چار افراد بھی اس عُہدے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ایک دعوت کے موقع پر انہوں نے اپنے ایک حریف ایڈلائی اسٹیونسن کے بارے میں کہا: "وہ بے وقوف ہے جو مجھ سے مقابلہ کرنے کھڑا ہو گیا ہے"۔

جان ایف کینیڈی کے قتل کے بعد جانسن امریکہ کے صدر بن گئے۔ نائب صدر کے عہدے کے لئے ایک

جانسن نے کینیڈی کی زندگی پر مبنی فلم کی نمائش بند کر دی

بار پھر رسہ کشی شروع ہو گئی۔ اس بار بھی باب کینیڈی اس عہدے پر آنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ جانسن خاموشی سے سارا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ٹیکساس ایئرپورٹ کا زخم پھر سے تازہ ہو گیا۔ وہ کسی قیمت پر اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ باب کینیڈی نائب صدر بن جائیں۔ اور اُن کے سینے پر مُونگ دلنا شروع کر دیں۔

اسی دوران آنجہانی جان ایف کینیڈی کی زندگی پر مبنی ایک ڈکومنٹری فلم ڈیموکریٹک نیشنل کنونشن میں دکھائی جانے والی تھی۔ سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ اور فلم کی نمائش کی تاریخ اور وقت کا اعلان بھی ہو چکا تھا۔ اس فلم کی نمائش سے کینیڈی خاندان کے لئے عوامی ہمدردی میں اضافہ ہوتا جس کی وجہ سے باب کینیڈی کی پوزیشن پارٹی سطح پر مزید مستحکم ہو جاتی۔ جانسن ہر قیمت پر اس فلم کی نمائش روکنا چاہتے تھے۔ ایک شام انہوں نے منتظمین کو خاموشی سے وہائٹ ہاؤس میں مدعو کیا اور چپکے سے کہا:

"اگر اس فلم کی نمائش اگلے ہفتے تک ملتوی کر دی جائے تو شاید میں بھی دیکھ لوں"۔

فرزانے منتظمین صدر کی بات خوب اچھی طرح سمجھ گئے۔ انہوں نے فلم کی نمائش روک دی۔ اس دوران جانسن نے بابی کینیڈی کو وہائٹ ہاؤس بلایا اور اپنے سامنے بٹھا کر کہا: "تمہیں معلوم ہے تمہارا نام نائب صدر کے امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے"۔ جانسن نے بعد میں انکشاف کیا کہ یہ خبر سُن کر بابی کینیڈی کا مُنہ موٹی مچھلی کی طرح کھُل گیا اور وہ زور زور سے سانس لینے لگا۔ بابی نے میری بات پر سخت اعتراض کیا مگر مجھ پر اس کا ذرا برابر اثر نہ ہوا۔

صدر جانسن مزید چند ہفتے بلّی چُوہے کا کھیل کھیلتے رہے اور بالآخر اپنے پسند کے نائب صدر ہمفرے کی نامزدگی کے لئے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ جانسن نے کینیڈی خاندان سے اپنی ٹھیک کا انتقام لے لیا۔



جہاں دِن رات دہشت رقص کرتی ہے

شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ اسکول کی ابھی چھٹی نہیں ہُوئی تھی۔ چُست لباس میں ملبوس دو نوجوان لڑکے اسکول کی ایک عمارت کے سامنے کھڑے ہُوئے بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ اُن کی لمبی سی گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ وہ دونوں بار بار اسکول کے گیٹ کی جانب دیکھتے اور پھر گھڑی دیکھنے لگتے۔ سڑک پر تیز رفتار گاڑیاں گذر رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والوں کی آمدورفت جاری تھی۔ کسی کے پاس اتنی مہلت نہ تھی کہ وہ رُک کر اُن دونوں پُراسرار لڑکوں سے پوچھ لیتا کہ آخر اتنی دیر سے وہ اسکول کے باہر کیا کر رہے ہیں؟ کس سے ملنا ہے، کیوں ملنا ہے؟

دراصل نیویارک شہر میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ بلاوجہ اپنے آپ کو کسی مسئلے میں اُلجھا کر اپنا وقت برباد کرے۔ یہاں ہر شخص کے پیروں میں ڈالر کا پہیہ لگا ہُوا ہے۔ ہر لمحہ قیمتی لمحہ ہے۔ ڈالر، پاؤنڈ اور اسٹرلنگ کا لمحہ ہے۔

اُن میں سے ایک لڑکے نے کہا "جمی انتظار کا وقت ختم ہُوا چھٹی کی گھنٹی بجنے والی ہے، بس وہ پری پیکر ناز و انداز سے چلتی ہُوئی آتی ہوگی" جمی نے فوراً گاڑی کے آئینے میں اپنے بالوں کو درست کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد چھٹی کی گھنٹی بجی، لڑکے اور لڑکیاں کلاسوں سے نکل آئے۔ ان میں بارہ سالہ میریا بھی تھی۔ صحت مند، خوبصورت، بلوریں آنکھیں۔ رخساروں پر دُھوپ کی تمازت تھی۔ اُس نے دُور سے دیکھ لیا کہ اُس کے پڑوسی ہارووڈ اور جم براؤن گاڑی میں بیٹھے اُس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اُسے بڑا اچنبھا ہُوا کہ وہ آخر اسکول کیوں پہنچ گئے۔ وہ دونوں لڑکوں سے واقف تھی، اس لئے زیادہ پریشان نہ ہُوئی اور مُسکراتی ہُوئی جمی کی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

جمی نے اُسے دیکھ کر کہا۔ "اِدھر سے گزر رہے تھے، سوچا تمھیں بھی ساتھ لیتے چلیں"۔

"شکریہ جم" میریا یہ کہتی ہُوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ہارووڈ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ چند میل دور سیدھ میں چلنے کے بعد گاڑی اچانک ایک ہائی وے کی طرف مُڑ گئی۔ میریا نے پریشان ہو کر پوچھا "جمی ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

جمی نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ "خاموشی سے بیٹھی رہو، چُوں چراں کی تو اُٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دوں گا"۔

میریا خوف سے سہم کر خاموش ہوگئی۔

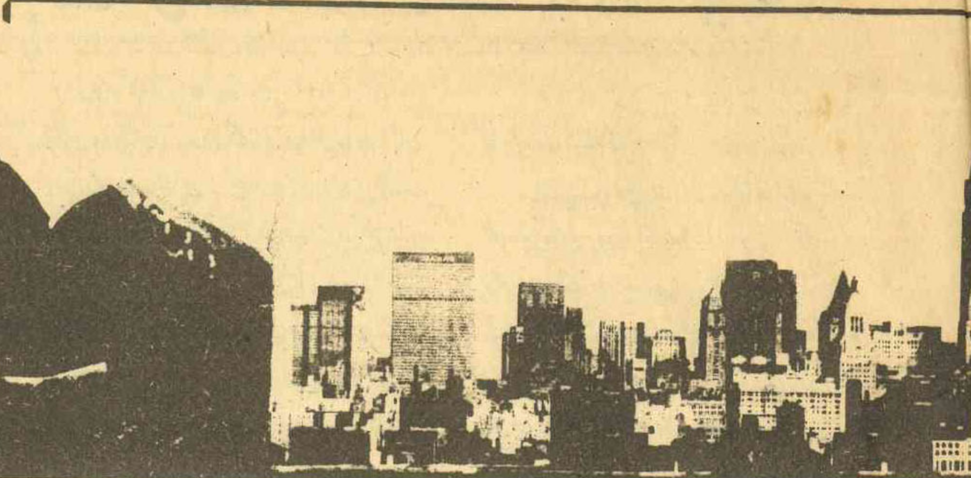
گاڑی ہائی وے سے کٹ کر ایک جنگل کی طرف مُڑ گئی۔ میریا نے ایک بار پھر دل کڑا کر کے احتجاج کرنا چاہا تو جمی کے ہاتھ میں لمبے پھل کا چاقو دیکھ کر اُس کی آدھی رُوح فنا ہو گئی۔ اُس نے ایک بار دُور سڑک کی ایک جھلک دیکھی جس پر گاڑیاں اُس کے حال سے بےخبر تیزی سے گزر رہی تھیں۔ اُن کی گاڑی جنگل کے درمیان انتہائی سنسان جگہ پر رُک گئی۔ دونوں نے اُسے نیچے اُتارا اور اُس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کر ایک درخت سے باندھ دیا۔ میریا چیخنا چاہتی تھی مگر اُس کی آواز گلے میں گھُٹ کر رہ گئی۔ وہ اپنی آنکھوں کے ذریعہ اُن سے رحم کی بھیک مانگتی رہی۔ مگر اُن وحشیوں پر اس کا کوئی



نیویارک میں غنڈہ گردی کا ایک منظر

ں آندھی طوفان کی طرح راستوں پر گھومتی رہتی ہیں





اثر نہ ہُوا۔ دونوں درندوں کی طرح میریا پر ٹوٹ پڑے۔

اِس واقعہ سے اگلے دن' جنگل کے چوکیدار نے پولیس کو فون کیا اور ایک بارہ سالہ لڑکی کی لاش کی اطلاع دی۔ پولیس نے فوری طور پر جنگل میں پہنچ کر میریا کی لاش پر قبضہ کر لیا۔ طِبّی تحقیقات سے پتہ چلا کہ پہلے میریا کی عزت لُوٹی گئی' اس کے بعد اُس کے جسم کو چاقو سے چھلنی کر دیا گیا۔ ڈاکٹر کا بیان تھا کہ "میریا کو بہت اذیت دے کر مارا گیا" آخر کیوں؟ ایک سوال تھا جو مجرموں کی گرفتاری کے بعد حل ہو گیا۔

جم اور ہارورڈ نے اپنے بیان میں کہا "ہم اُسے ایک دم سے ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ آہستہ آہستہ مارنا چاہتے تھے۔ ہم دونوں اس کی موت کا منظر دیکھ کر لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ یقین کیجئے وہ جتنا تڑپتی اور سِسکتی تھی اتنا ہی زیادہ ہمیں مزہ آیا۔"

یہ کسی فلم کا منظر یا کسی سنسنی خیز کہانی کا حِصّہ نہیں ہے' بلکہ یہ دُنیا کے سب سے امیر ترین ملک امریکہ کے ایک شہر نیویارک کا حقیقی واقعہ ہے۔ اس کی خبر ہمارے یہاں کے اخباروں میں بھی شائع ہُوئی تھی۔ اس واقعہ سے موجودہ امریکی معاشرے کا کھوکھلا پن اور وہ تمام بُرائیاں الم نشرح ہو جاتی ہیں جن پر ڈالر کا دبیز پردہ پڑا ہُوا ہے۔ امریکہ کے شہروں میں جرائم کے واقعات تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہر دُوسرے تیسرے منٹ ایک آدمی قتل کر دیا جاتا ہے۔ بدمعاشوں کی ٹولیاں آندھی طوفان کی طرح سڑکوں پر گھومتی رہتی ہیں — سینکڑوں اسٹوروں اور دکانوں کو دیکھتے دیکھتے نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔ پولیس خاموش تماشائی بنی رہتی ہے۔ صرف مارچ کے مہینے میں ۵، افراد کو انتہائی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔

نیویارک کے امن پسند شہری اپنا گھر چھوڑتے ہُوئے ڈرتے ہیں۔ وہ قریب کی عمارتوں میں بھی جانے سے گھبراتے ہیں۔ ایک اخبار نے شہر میں بڑھتے ہوئے جرائم کا سروے کیا۔

ایک شہری نے جواب دیا "ایسے شہری جو جرائم کی بیخ کنی میں مدد دیتے ہیں' انھیں دہشت گردی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔" ایک دُوسرے شہری نے بتایا "عورتوں اور بچّوں نے پارکوں اور تفریح گاہوں میں جانا ترک کر دیا ہے۔"

یہ نیویارک شہر ہے۔ امریکی قوم کا سب سے بڑا اقتصادی، کاروباری اور ثقافتی مرکز۔ اس شہر کی مثال دی جاتی ہے۔ سڑکیں رنگ برنگ روشنی سے جگمگاتی ہیں۔ بلند و بالا عمارتوں کی لمبی لمبی قطاریں انسان کی عظمت



پولیس نے ڈاکوؤں کی مدد کی

بروک لین میں لیری سن بلے کا ایک اسٹور تھا۔ اس میں کم سے کم ڈیڑھ لاکھ روپے کا سامان رکھا ہُوا تھا۔ ایک دن صبح ہی صبح وہ دکان کھول کر بیٹھا ہی تھا کہ اُس کی دکان کے سامنے ایک سیاہ رنگ کی کار آکر کھڑی ہو گئی۔ اس میں سے چند آدمی باہر نکلے۔ وہ سیاہ رنگ کے سُوٹ پہنے ہُوئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں پستول اور رائفلیں تھیں۔ وہ زبردستی دکان میں گھس گئے۔ انہوں نے الماری سے ساری نقدی نکال لی' کچھ قیمتی سامان بھی رکھ لیا۔ اور جب باہر نکلے تو پٹرول چھڑک کر' دکان کو آگ لگا دی اور فائرنگ کرتے ہُوتے فرار ہو گئے۔ ڈاکوؤں کی اس کارروائی کے دوران کسی طرح دوکان سے اس کا مالک فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے ایک قریبی پبلک بوتھ سے پولیس کو فون کیا —— اور گڑگڑا کر درخواست کی کہ وہ اُسے تباہ ہونے سے بچا لے' لیکن پولیس نے مہمل تاویلیں کر کے' موقعہ واردات پر پہنچنے میں اتنی تاخیر کر دی کہ ڈاکوؤں کو پوری دکان پر ہاتھ صاف کر کے فرار ہونے کا پورا موقع مِل گیا۔"

لیری سن نے نیویارک پولیس پر غفلت برتنے اور ڈیڑھ لاکھ مالیت کی دکان کو نقصان پہنچانے کے الزام میں مقدمہ چلا دیا ہے۔ اُس کا مقدمہ' نیویارک کی ایک عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔

زیادہ

سکتی

ہی

آتا 6

ایک اُستانی کو دن دہاڑے اُس کے شاگردوں نے اغوا کر لیا

اور سائنسی ترقی کی علامت بنی ہُوئی ہیں۔

نیویارک کے ایک ہسپتال میں کام کرنے والی نرس نے خوفزدہ لہجے میں کہا "میں موت سے ڈرتی ہُوں۔ ان سڑکوں پر ہر وقت موت منڈلاتی رہتی ہے انسان کسی بھی لمحہ اس کی زد میں آسکتا ہے۔ میں ایک رات دیر سے اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہُوئی، بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ اتنے میں ایک تیز رفتار گاڑی گزری کھڑکی سے ایک سیاہ ہاتھ برآمد ہُوا جس میں پستول دبا ہُوا تھا۔ اچانک فائرنگ ہُوئی اور میرے سر سے ایک انچ اُوپر گولی سنسناتی ہُوئی گذر گئی۔ میں اس واقعہ سے اس قدر بد حواس ہُوئی کہ بلا سوچے سمجھے ایک جانب بھاگنا شروع کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ راستے میں پولیس کے ایک گشتی دستہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اُس نے سارا واقعہ سُن کر مجھے گھر پہنچا دیا۔ اگر پستول سے نکلی ہُوئی گولی مجھے لگ جاتی۔۔۔ پھر" نرس ایک جھرجھری لے کر خاموش ہوگئی۔

نیویارک میں جرائم کے واقعات عموماً رات کے وقت ہوتے ہیں۔ گذشتہ سال ٹیلیفون اور بجلی کے تار مرمت کرنے والے تقریباً ۹ ہزار ملازمین نے ہڑتال کر دی تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ رات کے وقت کام کے دوران اُن کی زندگی کا تحفظ کیا جائے کیونکہ اکثر رات کی تاریکی میں انھیں مارا پیٹا جاتا ہے اور گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر ہلاک کر دیا جاتا ہے"۔ ٹیلیفون کے ملازموں کی اس اسٹرائیک میں اخبار کے ہاکرز اور پوسٹ مین بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ پوسٹ مینوں کا کہنا تھا کہ "جب وہ ڈلیوری کے لئے جاتے ہیں تو اُن پر حملہ کر دیا جاتا ہے، اور اُنھیں سنسان جگہوں میں گھیر کر لوٹ لیا جاتا ہے۔ مزاحمت کرنے کی صُورت میں اُنھیں جسمانی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ کئی پوسٹ مین تشدد کے سبب ہلاک ہوگئے۔ اگر اس قسم کے واقعات کی روک تھام موثر انداز میں نہ کی گئی تو ممکن ہے پوسٹ مین اپنا کام چھوڑ دیں۔

بلڈنگ سروس ایمپلائز انٹرنیشنل یونین کے نائب صدر ٹام ینگ نے اخباری نمائندوں سے کہا "ہمارے آدمی اس جنگل میں موت سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ نیویارک شہر میں رہنے والے کرایہ دار مجرموں کے رحم و کرم پر ہیں۔ غنڈے دن دہاڑے گھروں میں گھس کر لُوٹ مار کرتے ہیں۔ اور کرایہ داروں کو زخمی کرکے فرار ہو جاتے ہیں۔ عمارتوں کی مرمت کرنے والے ملازمین بھی ان کی دہشت گردی سے محفوظ نہیں ہیں۔ انہیں کام کے دوران گولیوں کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے"۔ ٹام نے بتایا "ہمارا ایک آدمی ایک عمارت کی مرمت کر رہا تھا اچانک اس عمارت میں غنڈوں کا ٹولہ گھس آیا۔ لوگوں نے مزاحمت کی تو لٹیروں نے اندھا دُھند فائرنگ کرکے بے شمار افراد کو زخمی کر دیا۔ ہمارے آدمی کو بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اُس کے چار بچے تھے۔ اس کی موت سے پُورا خاندان بے سہارا ہوگیا"۔

نیویارک کے ایک علاقہ مین ہاٹن اسٹریٹ کی ۹۶ ویں شاہراہ کے ایک باشندے پیٹرک ملیریان نے کہا: "میں اپنے پڑوس میں کتے کے ساتھ ٹہلنے سے بھی گھبراتا ہُوں۔ دن دہاڑے مجرموں کی ایک ٹولی نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ اور میرے پاس جو کچھ تھا، لوٹ کر لے گئے۔ چلتے چلتے انہوں نے مجھے اتنی ٹھوکریں لگائیں کہ میرا حلیہ بگڑ گیا۔ میرے ایک زخم میں پندرہ ٹانکے لگے تھے"

اسی علاقے میں رہنے والی ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے بتایا "میرے گھر میں کئی بار ڈاکہ ڈالا گیا۔ مجھے مجبور ہوکر اپنے گھر کے دروازے اور کھڑکیوں پر آہنی سلاخیں لگانی پڑیں"۔ نیویارک کے پبلک اسکول بھی دہشت گردی سے محفوظ نہیں ہیں۔ مختلف اسکولوں کے اساتذہ پر ۱۹۶۹ء میں ۲۱۷ مرتبہ حملے کئے گئے۔ اسکول ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر نے بتایا کہ معلمات کو خاص طور پر ہراساں کیا جاتا ہے۔ ایک اُستانی کو دن دہاڑے اسکول کے نوجوان لڑکوں نے اغوا کر لیا۔ ایک دُوسری اُستانی کی کار میں آتش گیر مادہ رکھ دیا گیا جس سے اُس کی کار کی چھت اُڑ گئی۔

دُنیا کے سب سے متمول اور مہذب ملک کا سب سے بڑا شہر نیویارک موت کا شہر بن گیا ہے۔ یہاں کے باشندے خوف میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ موت برحق سہی، مگر ایسی موت بھی کیا کہ گھر سے کسی کام کے لئے نکلے اور راستے میں کسی غنڈے کی گولی کا نشانہ بن گئے۔

ڈسٹرکٹ اٹارنی کے گھر پر غنڈوں کا حملہ

ہرک لین ڈسٹرکٹ اٹارنی، ایران ای کوٹا نے حکومت سے اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ "پولیس کو ہتھیار استعمال کرنے کی مکمل آزادی ملنی چاہیئے"۔ ایک ایسے شہر میں جہاں قدم قدم پر موت گردش کرتی ہے۔ صرف مارچ کے مہینے میں ۸۳ افراد قتل کئے گئے۔ ۱۹۶۹ء میں ۸۵ مرتبہ فسادات ہُوئے اس شہر میں پولیس کو مہلک ہتھیار چلانے کا پُورا حق ملنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا۔ پولیس کو جرائم سے مقابلہ کرنے کا پُورا اختیار ہے۔ لہٰذا اُسے ہتھیاروں کے استعمال میں بھی آزادی ہونی چاہیئے" کہا جاتا ہے کہ کوٹا نے جس روز بیان دیا، اُس کے دُوسرے ہی دن شہر کے غنڈوں نے اُن کے گھر پر دھاوا بول دیا اور سارا سامان لُوٹ کر لے گئے



اشرف نگر

مہاجر آبادکاری مالیاتی کارپوریشن اور کے ڈی اے کے درمیان مُرغی حرام

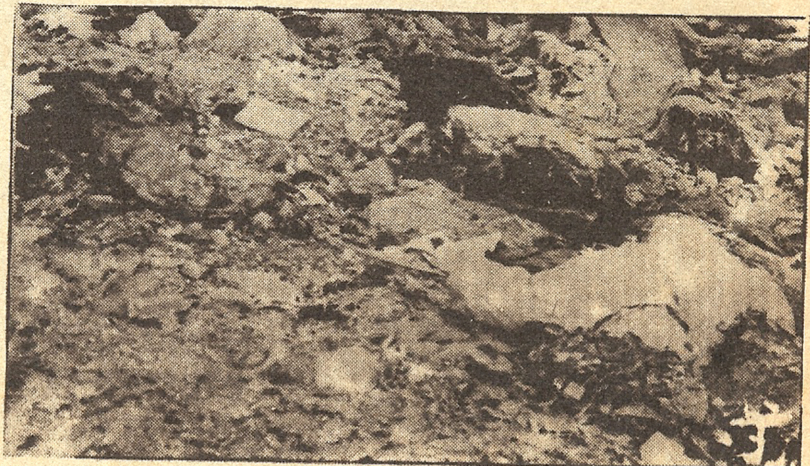
وہاب صدیقی

وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، رگ رگ سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ اُسے وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آ رہا تھا جسے وہ ۱۸ سال سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنستا مسکراتا اپنی جھگی والی گلی میں داخل ہُوا تو آج پہلی مرتبہ تنگ و تاریک ماحول، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں اور بدبودار پانی کے گڑھوں کا احساس ہُوا "اُف کتنی بدبو ہے، سانس بھی نہیں لے سکتے۔ اب جلد ہی اس عذاب سے چھٹکارا مل جائیگا۔" وہ بڑبڑایا ٹاٹ کا پردہ اُٹھا کر وہ جھگی میں داخل ہُوا اور اپنی بیوی کو پکارا "مُنے کی اماں کہاں ہو، جلدی آؤ، ایک خوشخبری سنو آج سے ہم بھی مکان والے بن گئے ہیں منے کی اماں بھاگتی ہُوئی آئیں "کیا مکان، کیسے مکان والے، کہیں دیوانے تو نہیں ہو گئے" "نہیں بیگم سچ کہہ رہا ہُوں۔ یہ دیکھو مہاجر آبادکاری مالیاتی کارپوریشن نے اشرف نگر میں ہمیں پلاٹ الاٹ کر دیا ہے۔ اب ہم جلد ہی اس اندھیاری گلی کو چھوڑ دیں گے۔ اُف یہاں کتنی بدبو ہے۔ مچھر رات کو سونے بھی نہیں دیتے۔ منا اسی لئے تو بیمار رہتا ہے۔ اب یہ اشرف نگر میں صاف ستھرے مکان میں رہے گا۔ وہاں پارک بھی ہوگا۔ شام کو ہم وہاں جایا کریں گے" رات گئے تک وہ اسی طرح کی باتیں کرتا ہُوا نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ خواب میں بھی اُسے دو کمروں کا چھوٹا سا مکان نظر آتا رہا۔

اگلی صبح وہ منہ اندھیرے اُٹھ گیا۔ جلدی جلدی تیاری کی، اور مہاجر آبادکاری مالیاتی کارپوریشن کے دفتر کی راہ لی۔ وہاں اُس نے پلاٹ کی قیمت جمع کرا دی دو ماہ بیت گئے۔ پلاٹ پر قبضہ نہیں ملا۔ مہاجر آبادکاری مالیاتی کارپوریشن کے دفتر کے چکر لگانا اُس کی ڈیوٹی میں شامل ہو گیا۔ پلاٹ پر قبضہ تو نہیں ملا، البتہ کارپوریشن کی جانب سے سیوریج چارجز کی رقم جمع کرانے کا نوٹس آگیا، جسے اُس نے ادا کر دیا۔ اس کے بعد بھی پلاٹ پر قبضہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ تین ماہ بعد سیوریج چارجز کی دوسری قسط ادا کرنے کا حکم ملا، وہ بھی جیسے تیسے ادا کر دی۔ تمام ادائیگیوں کے باوجود مہاجر آبادکاری مالیاتی کارپوریشن پلاٹ پر قبضہ دلوانے میں ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ کارپوریشن کے دفتر کا طواف کرنا اُس کا روزمرّہ کا معمول بن گیا۔ آخر خدا خدا کر کے جنوری ۱۹۶۶ء میں پلاٹ پر قبضہ دلایا گیا۔

اس نے اور اشرف نگر کے ۲۰۰ الاٹیوں نے مکانات تعمیر کروائے۔ یہ ایک طویل اور المناک داستان ہے۔ ۶۶ مربع گز کے پلاٹ کے حصول، مکان کے نقشے کی منظوری اور دیگر کاموں کے لئے انہوں نے مہاجر آبادکاری مالیاتی کارپوریشن، کے ڈی اے اور دیگر سرکاری دفتروں کے کتنے طواف کئے یہ صرف اشرف نگر کے باسی ہی جانتے ہیں اور پھر اس مکان کی تعمیر کے لئے کسی نے اپنی بیوی کا زیور فروخت کیا تو کسی نے قرض کے لئے ہاتھ پھیلائے اور کسی نے چند تنخواہ کی ملازمت کی، محض اس لئے کہ اُنھیں اور اُن کے بچّوں کو صاف ستھرا ماحول میسّر آسکے لیکن آہستہ آہستہ اُن کے سنہرے خوابوں کے تانے بانے ٹوٹنے لگے۔ اشرف نگر میں بھی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگ گئے۔ بدبودار پانی کے گڑھے وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے۔ مچھروں کی بہتات سے نیندیں حرام ہونے لگیں۔ سرکاری نل سے پانی بھر کر لانا گویا روزمرّہ کے فرائض میں شامل ہو گیا۔ اور اشرف نگر "مسائل کی بستی" بنتا گیا۔ یہاں کا ماحول بھی تاریک ہوتا گیا۔ اور گلیاں اندھیاری ہوتی گئیں۔

اشرف نگر کے باسیوں نے متعدد بار مہاجر آبادکاری مالیاتی کارپوریشن سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے دفتر میں عرضیوں کے انبار لگا دیئے کہ جب اشرف نگر کے الاٹیوں سے سیوریج اور آب رسانی کے چارجز لئے گئے ہیں تو اُنھیں یہ سہولتیں مہیا کی جائیں لیکن کارپوریشن کے حکام ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔ کبھی کہتے کہ سیوریج اور آب رسانی کی ذمہ داری کے ڈی اے کی ہے۔ مہاجر آبادکاری مالیاتی کارپوریشن کی نہیں ہے" کبھی ارشاد ہوتا کہ "ہم نے کے ڈی اے سے رابطہ قائم کیا ہے، عنقریب یہ کام ہو جائے گا" اور جب کے ڈی اے سے رابطہ قائم کیا گیا تو اس نے سرے سے ہی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور تمام ذمہ داری مہاجر



اشرف نگر میں غلاظت کے ایک ڈھیر کا منظر

پانی — پودوں کے لئے، بچوں کے لئے نہیں

آباد کاری مالیاتی کارپوریشن کے سرپرستِ منتظمیہ کے دیگر حکام نے بھی کوئی دادرسی نہ کی۔

مارچ ۱۹۶۹ء میں مارشل لاء لگا تو اشرف نگر والوں نے مارشل لاء حکام سے فریاد کی۔ کیس متعلقہ حکام کو بھیجا گیا، تو معلوم ہُوا کہ اشرف نگر کے لے آؤٹ پلان پر مہاجر آباد کاری مالیاتی کارپوریشن اور کے ڈی اے کے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہو گئے تھے اس لئے کے ڈی اے نے ابھی لے آؤٹ پلان منظور نہیں کیا ہے۔ ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو وزارتِ قانون نے اس تنازعہ کا تصفیہ کر دیا۔ اور صوبائی حکومت نے ۱۲ مارچ ۱۹۷۰ء کو حکم دیا کہ کے ڈی اے مہاجر آباد کاری مالیاتی کارپوریشن کا داخل کردہ لے آؤٹ پلان فوری طور پر منظور کرے۔

صوبائی حکومت کے اِن احکامات سے جہاں اشرف نگر کے باسیوں کے دلوں میں امیدوں کے چراغ روشن ہوتے وہاں اُنھیں ایک نئی آفت کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ مہاجر آباد کاری مالیاتی کارپوریشن کے بعض بدعنوان افسران نے ایک مبینہ سازش کے ذریعہ پرانے الاٹمنٹ منسوخ کرانے اور زمین پر غیر الاٹیوں کو ناجائز قبضہ دلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اشرف نگر کے لوگ ان سازشوں سے بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے فوراً کمشنر کراچی سے ملاقات کی۔ صوبائی حکومت کے دیگر حکام بالا کو تار بھیجے۔ بر وقت اقدام سے بستی کے رہنے والوں کو ناجائز قابضین سے تو نجات مل گئی لیکن لے آؤٹ پلان کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ کارپوریشن کے حکام نے پلان کی منظوری میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ اور کے ڈی اے سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔

ان ہی لیل و نہار میں چھ ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ اشرف نگر کے لوگوں نے ناظم بنیادی جمہوریت کراچی کو ایک یادداشت بھیجی جس پر ناظم بنیادی جمہوریت کراچی نے کے ڈی اے سے رابطہ قائم کیا تو کے ڈی اے کے ڈپٹی سیکریٹری ودم نے اپنے خط نمبر کے ڈی اے/۱۴-/۴۹/۶۴-ڈی ای وی/۱۳۵۴۴ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۰ء میں یہ انکشاف کیا کہ "ابھی تک صوبائی حکومت نے پاپوش نگر کالونی میں مہاجر آباد کاری مالیاتی کارپوریشن کو پانچ ایکڑ زمین دینے کا اجازت نامہ جاری نہیں کیا ہے اور اس اجازت نامے کے بغیر کے ڈی اے لے آؤٹ پلان منظور کرنے سے قاصر ہے"

اس پر ناظم بنیادی جمہوریت نے اپنے خط نمبر ۵/۸۴/۶۹-ایل جی/ (ڈی ای وی) مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں سندھ کے سیکشن افسر صحت، محنت، سماجی بہبود، اور لوکل گورنمنٹ سے اجازت نامہ کے اجراء کی استدعا کی لیکن یہ اجازت نامہ ابھی تک نہیں نکلا۔

اشرف نگر کے لوگ حیران ہیں اور یہ سوالات کر رہے ہیں کہ :—

- جب مہاجر آباد کاری مالیاتی کارپوریشن کو حکومتِ سندھ نے زمین نہیں دی تھی تو اُس نے کن اختیارات کے تحت لوگوں کو زمین الاٹ کر دی؟
- لے آؤٹ پلان کی منظوری کے بغیر سیوریج اور آب رسانی کے چارجز کن اختیارات اور کن قوانین کے تحت وصول کئے گئے؟
- جب الاٹیوں نے زمین کی پوری قیمت ادا کر دی ہے تو حکومت زمین دینے کا اجازت نامہ دینے میں پس و پیش کیوں کر رہی ہے؟

ان سوالات نے کراچی کے عام شہریوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ مہاجرین کی آباد کاری میں کون سا خفیہ ہاتھ رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ یہ سوالات مارشل لاء حکام کی توجہ کے محتاج ہیں اور اُنھیں دعوتِ عمل دے رہے ہیں۔

اشرف نگر عوامی بستی ہے، اس لئے یہ سیوریج، اور آب رسانی کی سہولتوں سے محروم رکھی گئی ہے اس کے برخلاف اسی سے ملحق پاپوش نگر اور ناظم آباد ہیں۔ یہاں پر سیوریج اور آب رسانی کی تمام تر سہولتیں مہیا ہیں۔ پاپوش نگر اور ناظم آباد میں درختوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ لانوں کی ہریالی میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن اشرف نگر کے ننھے مُنّے پھول جیسے بچّے پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے ہیں۔ یہ انصاف ہے اور نہ معیارِ انسانیت کہ خواص کی بستیوں کو خوبصورت اور جاذبِ نظر بنانے کے لئے اتنا پانی فراہم کیا جائے کہ اُن بستیوں کے پودے پانی کی بہتات سے جل جائیں دوسری جانب عوامی بستیوں کے باسی پینے کے پانی سے بھی محروم رہیں۔

سندھ اسپورٹس کنٹرول بورڈ کا جائز فیصلہ

اسپورٹس تنظیموں کا بوگس شور

لطافت علی صدیقی

نو تشکیل سندھ اسپورٹس کنٹرول بورڈ نے مقامی اسپورٹس تنظیموں کو دی جانے والی سالانہ امداد میں زبردست تخفیف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ امداد کے نام پر وصول کی جانے والی رقم کا بڑا حصّہ ضائع کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق بورڈ نے سال رواں کے لئے صرف ۱۹ ہزار کی امداد منظور کی ہے۔ جب کہ گذشتہ سال ۳۹ ہزار کی امداد دی گئی تھی۔ اس طرح سال گذشتہ کے مقابلہ میں امسال امداد کی رقم میں ۲۰ ہزار روپے کی تخفیف کر دی گئی ہے۔

سندھ اسپورٹس کنٹرول بورڈ کے اس اقدام کے خلاف اسپورٹس کے مقامی اداروں کے سیکرٹریوں نے شدید ناراضگی کا اظہار کیا۔ ۱۴ جون کو ایک میٹنگ بلائی گئی تھی جس میں سندھ بورڈ کے اس فیصلے پر نکتہ چینی کی گئی، اور امداد کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ قلیل امداد ناکافی ہے۔ چھ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بھی تشکیل دے دی گئی۔ جس کا کام سندھ کے گورنر سے مل کر انھیں پوری صورتِ حال سے آگاہ کرنا ہے۔ سیکرٹریوں نے حیدر آباد ڈویژن کی امداد میں اضافہ کرنے کے فیصلے پر بھی ناراضگی کا اظہار کیا۔ بورڈ نے ان علاقوں کی امداد میں اضافہ کرنے کا فیصلہ پس ماندہ علاقوں میں کھیلوں کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے پیشِ نظر کیا ہے۔ سندھ کی تقریباً تمام تنظیموں کی جانب سے بورڈ کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا گیا۔ کراچی والوں نے فیصلہ کیا ہے وہ ۸۰ ہزار سے کم امداد ہرگز قبول نہیں کریں گے۔

یہ صحیح ہے کہ ۱۹ ہزار کی امداد کراچی کی اسپورٹس تنظیموں کے لئے ناکافی ہے۔ پھر بھی ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ یہاں ایسی کتنی فعال تنظیمیں سرکاری امداد کی مستحق ہیں۔ اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ایسے چند ادارے ہیں جو سرکاری امداد کے مستحق ہیں، ان میں ٹیبل ٹینس، اور کرکٹ بورڈ کی امداد کے اہل ہیں۔ کیونکہ یہ ادارے پورا سال کوچنگ پروگرام اور تربیت کا انتظام کرتے ہیں اس کے باوجود دیکھنے میں یہی آیا کہ ان اداروں نے امداد بٹورنے کے لئے کبھی شور نہیں مچایا۔ جب کہ دُوسرے ادارے گلے پھاڑ پھاڑ کر "امداد، امداد" کا شور مچاتے ہیں۔

کراچی کرکٹ ایسوسی ایشن نے سیکریٹریوں کے اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ اس لئے کہ اُس کے پاس فنڈ موجود ہے۔ اور اُس نے امداد کی درخواست بھی نہیں دی تھی۔ لان ٹینس ایسوسی ایشن نے نیم دلی سے شرکت کی۔ اگر ان اداروں کو گرانٹ مل گئی تو فبہا ورنہ وہ خود اپنے طور پر اس کا انتظام کر لیتے ہیں۔ ملک میں اسپورٹس کا یہ واحد ادارہ ہے جو کے ایم سی کلب کورٹ میں تربیت کا مستقل انتظام کرتا ہے۔ دوسری معقول تنظیم ٹیبل ٹینس کی ہے۔ یہ تنظیم بھی گرانٹ کے لئے بھاگ دوڑ نہیں کرتی، اور نہ ہی شور مچاتی ہے۔ خاموشی سے اپنا کام کرتی ہے۔ اور ہر سال کھلاڑیوں کی ایک کھیپ تیار کرتی ہے۔ دوسری تنظیموں کے متعلق

> **بیڈمنٹن، فٹ بال، تیراکی**
> **کُشتی، کبڈّی اور تن سازی**
> **کے اِداروں نے ہزارِوں**
> **روپے کی امداد کا کیا کِیا؟**

"تھوتھا چنا، باجے گنا" کی ضرب المثل صادق آتی ہے۔ بیڈمنٹن، کشتی، باڈی بلڈنگ، جمناسٹک اور کبڈی کی تنظیمیں غیر منظم اور غیر فعال ہیں۔ ایک پیسے کی امداد کی بھی حقدار نہیں ہیں۔ بیڈمنٹن ایسوسی ایشن کی کہانی تو انتہائی تکلیف دہ ہے بیڈمنٹن کے تمام کھلاڑی ایسوسی ایشن کو "خوابیدہ حسن" کے نام سے پکارتے ہیں۔ انہوں نے ایک علیحدہ تنظیم کا ڈھانچہ کھڑا کر لیا ہے۔ جس کا نام بیڈمنٹن گلڈ ہے۔ اس تنظیم کے توسط سے کھلاڑیوں کو باہر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اب ہمیں دیانتداری سے اس پر غور کرنا ہوگا کہ امداد بیڈمنٹن گلڈ کو ملنی چاہیئے یا ایسوسی ایشن کو؟

فٹ بال ایسوسی ایشن، متمول ادارہ ہے۔ گذشتہ سال متعدد میچوں میں گیٹ کے ذریعے اُسے خاصی رقم مل گئی۔ لیکن یہ ادارہ بھی خرد بُرد اور غبن کے واقعات سے محفوظ نہیں ہے۔ پچھلے چند سالوں سے اس قسم کے متعدد واقعات رونما ہوئے ہیں اور غبن کا ایک مقدمہ تو ابھی تک ایک مقامی عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس تنظیم نے پچھلے ایک سال کے دَوران ایک بھی ٹورنامنٹ کا انتظام نہیں کیا۔ اور حریف گروپ کے ساتھ اقتدار کے حصُول کے لئے پنجہ آزمائی میں اپنا وقت برباد کر رہی ہے۔ کیا ایسی تنظیم کسی سرکاری امداد کی مستحق ہو سکتی ہے؟

آخری تنظیم ہاکی کی رہ جاتی ہے۔ گذشتہ ماہ نیشنل ہاکی چیمپئن شپ کے مقابلوں کے دَوران، اس تنظیم کو ٹکٹوں کی فروخت سے تقریباً ۲۵ ہزار روپے حاصل ہُوئے۔ اس رقم کو نوجوان کھلاڑیوں کی تربیت پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مسٹر تبسم بیک وقت ہاکی اور فٹ بال ایسوسی ایشن کے کرتا دھرتا ہیں۔ اور تبسم گروپ کے چیف مسٹر انوار چودھری اس شہر کی ۹۰ فیصد اسپورٹس تنظیموں کے سربراہ ہیں۔

سندھ اسپورٹس کنٹرول بورڈ کو گرانٹ دینے سے قبل اس بات کی چھان پھٹک کرنی ہوگی کہ پچھلی امداد کو جائز طریقے سے استعمال کیا گیا ہے یا اسپورٹس کے وسیع تر مفادات کو پس پشت ڈال کر خیانت کی گئی ہے۔ اس کام کی پوری ذمہ داری کنٹرول بورڈ پر عائد ہوتی ہے

دھونس دیکر مہمانِ خصوصی بننے والی بیگم

سلمیٰ جبیں

گذشتہ ہفتے ہم نے جان بُوجھ کر بیگموں کا خاکہ اُڑانے والی خاتون کو صیغۂ راز میں رکھا تھا۔ لیکن یُوں چھُپ چھُپ کر وار کرنے سے فائدہ — یہ لاہور کی مشہور اخبار نویس، ناول نگار اور ڈرامہ نویس، خاتُون سلمیٰ جبیں ہیں۔ انہوں نے ہر ہفتے کِسی بیگم سے قارئینِ "الفتح" کی مُلاقات کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ بیگمات ہمارے معاشرے کی ایک خاص چیز ہیں اس لئے اُن کا تعارف، اور آپ سے ازحد ضروری ہے۔

(ادارہ)

اُردو کی ترقی میں

اُن کے خانساماؤں کا ہاتھ ہے

آپ کی ذات تعارف کی محتاج نہیں۔

مشہور سیاسی لیڈر، معروف سماجی کارکن اور مختلف انجمنوں کی سرپرست صحت مند خاتون ہیں۔ ان کی شہرت کی بیشمار وجوہات میں سے ایک، اُن کی حد سے بڑھی ہوئی صحت بھی ہے۔ خواتین کا کہنا ہے کہ اُسی صحت نے انہیں "پرومینینٹ نگر" بنا دیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ "نگر" کی وجہ سے پرومیننٹ ہوگئی ہیں۔

آپ کی معلُومات کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ زمانے بھر کے کھانوں کا رتّی رتّی حال جانتی ہیں۔ دُنیا بھر سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے خانساماں لوگ گھر میں اکٹھے کر رکھے ہیں۔ باورچی خانے اور کھانے کے کمرے کے علاوہ اُن کے محل نما گھر کی غلام گردشوں میں بھی یہی خانساماں، یعنی باورچی جنھیں اب تک اور اگلے وقتوں کی کہانیوں میں نانبائی کہتے تھے، گردش کر رہے ہوتے ہیں۔

اہم عالمی مسائل سے متعلق جب بھی کوئی تقریب اُن کے ہاں منعقد ہوتی ہے۔ یہ مہمانوں سے کھانوں کا اور اپنے خانساماؤں کا تعارف کچھ ایسے انہماک سے کراتی ہیں جیسے ان کی گفتگو کے بعد، قبرص، ویت نام، فلسطین، کمبوڈیا اور کشمیر کا مسئلہ آپ ہی آپ حل ہو جائے گا۔ یوں دیکھئے تو اُن کے گھر پر بھی الف لیلے کے ایک باب کا گمان گزرتا ہے۔ جہاں پر قصّے کہانی کا کلائمکس، میوۂ تر، فواکۂ خشک، اطعمۂ لذیذ اور نقل و بادۂ خوشش گوار ہے۔

فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت رقص و موسیقی کو دیتی ہیں۔ رقص کو زندگی کا سب سے حسین زاویہ سمجھتی اور اس قسم کی ثقافتی تقریبات میں اگر دھونس دیکر بھی مہمانِ خصوصی بننا پڑے تو گریز نہیں کرتیں۔ ویسے مہمانِ خصوصی بننے کا انھیں ایسا "ہوکا" لگا ہے کہ اپنے گھر کے ہنگاموں میں بھی بطور مہمانِ خصوصی ہی شریک ہوتی ہیں۔

ایک کلچرل پروگرام میں مہمانِ خصوصی ہی کی حیثیت سے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا رقص خیالات وجذبات کے اظہار کا ایسا ذریعہ ہے کہ الفاظ اُس کے سامنے قطعی فضول سے معلوم ہوتے ہیں۔ محبت، نفرت، رنج، غصّے، تاسف، انتظار، خوشی، ملن، جدائی، لڑائی، کونسی بات ہے جس کا

اخباری فوٹوگرافر — اُن کی اچھی صحت کا راز

اظہار رقص کے زاویئے نہیں کرسکتے ۔ رقص کا پسِ منظر سمجھانے کے لیئے جب وہ نرتکیوں رقاصاؤں اور نٹ راجاؤں سے ہوتی ہوتی تین ہزار برس پیچھے چلی گیئں تو سننے والوں نے دانتوں میں انگلیاں داب لیں کہ واقعی اُنھیں فنونِ لطیفہ کے ہر موضوع پر دسترس حاصل ہے ۔ اور کہنے والوں نے دبی دبی زبان سے آئندہ ذرا رقوں میں اُن کا نام بھی تجویز کردیا ۔ خود وہ تقریب کے بعد پسینے میں ڈوبی ہانپ رہی تھیں' اور انتظار حسین کے سے انداز میں دہائی دے رہی تھیں کہ صاحبو! بہت سے آدمیوں کا مل کر تقریر لکھ لینا تو کوئی بات ہی نہیں ۔ بات بہت سے آدمیوں کی مل کر لکھی ہوئی تقریر کو جوں کا توں یاد کرنا اور یاد رکھ لینا ہے۔

اخبار والوں سے انہیں اللہ آمین کی محبت ہے ۔ ان کے بغیر کسی تقریب کا اہتمام نہیں کرتیں ۔ رپورٹر کے بغیر تو شاید کسی تقریب میں وقت کاٹ لیں پر فوٹوگرافر کے بغیر ایسا نہیں کرسکتیں ۔ اپنے نواسے کے ختنے کی تقریب میں بضد تھیں کہ رسمِ افتتاح میرے ہاتھوں ادا ہوگی ۔ اک ذری فوٹوگرافر کو توآ لینے دو۔

مختلف انجمنوں کی سرپرستی قبول کر لینے میں بھی اُن کا جواب نہیں ۔ ایک بار اردو کی ترقی کے سلسلے میں کچھ احباب اُن کے ہاں پہنچے کہ ہماری انجمن کے سر پر ہاتھ رکھنے والا بھی کوئی نہیں، کچھ آپ ہی توجہ کیجیئے ۔ انہوں نے فوراً ہی ہاتھ بڑھایا، اور سارے خاندان کو اردو کی ترقی کے کاموں پر لگا دیا۔

کوئی چار ایک جلسے ہی اس انجمن کے ہو پائے تھے کہ پنجابی، سندھی، پشتو، انگریزی، بنگالی اور فارسی انجمنوں کے بانیان اور اراکین کو بھی جوش آیا ۔ وہ اُن کی طرف دوڑے ۔ اور نتیجتہً اُن کے 'گکس' کو باقی زبانوں کی ترقی و ترویج کے لئے بھی چچے چلانے پڑے "بہتر واقفے ہی سے زبان کی خدمت ہوسکتی ہے" یہ اُن کا اپنا مقولہ ہے۔

ان کی ایک دوست خاتون نے اپنی قیام گاہ پر خواتین کے جنرل اسٹور اور پبلک بیوٹی کلینک کا افتتاح کروایا ۔ تو مارے مروّت کے انہیں مہمانِ خصوصی بنا ڈالا ۔ اب آپ قینچی لئے کھڑی ہیں کہ فوٹوگرافر آئے تو فیتہ کاٹوں گی ۔ ویسے جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا ۔ غیر خصوصی مہمانوں نے التجائیں کیں کہ ازراہِ کرم فیتہ کاٹ ڈالیئے ۔ تصویر بعد میں اس پوز کی کھینچوا لیں گے ۔ پر وہ نہ مانیں ۔ بولیں، فوٹوگرافروں کی غیر موجودگی میں ایسے کام کرنے کی عادت نہیں ہے ۔ ویسے بھی فنکشن میں فوٹوگرافر نہ ہو تو جی الجھا الجھا سا رہتا ہے۔ اور طبیعت بجھی بجھی سی ۔ میزبان خاتون نے یہ رنگِ محفل دیکھا تو دوڑیں اخبار کے دفتروں کی طرف، پھر اخبار میں تصویروں کے چھپنے کا انتظام ہوا اور پھر کہیں جا کر فیتہ کٹا۔

ان کی سماجی سرگرمیوں کے ایک خاص فیلڈ کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے ۔ مختلف علاقوں میں انڈسٹریل ہوم قائم کر کے عورتوں کو روزگار دلانا اُن کی زندگی کا نصب العین ہے ۔ وہ یہاں خواتین سے سلائی بنائی، کٹائی، کشیدہ کاری کا کام اُجرت پر کروا کے انہیں خود کفیل بناتی ہیں اور بڑے بڑے مہمانوں کو ان دستکاری مراکز کی سیر کرواتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ میری اس جدوجہد سے عورتوں کو باعزت طور پر روٹی کمانے کا موقع ملا ہے ۔ مہمان باروزگار عورتوں کے ہاتھوں کو دیکھتے ہیں تو چھدی ہوئی اُنگلیاں، اُڑے ہوئے پپوٹے، ہتھیلیوں کے چھالے، آنکھوں کی کم ہوتی ہوئی بینائی اور چہروں کی بڑھتی ہوئی زردی پوچھنے لگتی ہے "کیا واقعی —؟"

گجرات

باثر لوگوں کو پولیس سے ذاتی اغراض پورا کرنے سے روکا جائے

نمائندہ خصوصی

ضلع گجرات اور اُس کے گرد و نواح کے علاقوں میں انسانی مسائل روز بروز پیچیدہ اور سنگین صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں جنھیں حل کرنے کے لئے بجٹ اور منصوبہ بندی کے انتظار میں وقت برباد کیا جائے۔ ان میں کچھ مسائل تو اتنے چھوٹے اور معمولی نوعیت کے ہیں کہ انھیں فوری طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر انسانی مسائل ایک جیسے ہوتے ہیں اور انھیں بلا تاخیر حل کر کے شہری اور دیہی عوام کی زندگی کو معمول پر لایا جا سکتا ہے مگر نوکر شاہی اور میٹھی گرم ہونے کے بعد اپنی جگہ سے ہلنے والے چھوٹے چھوٹے کارندے ہر جگہ آڑے آتے ہیں۔

ضلع گجرات کی تحصیلوں میں بھی بے شمار ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل موجود ہیں، جنھیں وقت گنوائے بغیر آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً۔

۱۔ لالہ موسٰی کے مجوزہ گورنمنٹ کالج کی عمارت جی ٹی روڈ پر تعمیر کی جائے۔

۲۔ سرائے عالمگیر کے شہریوں پر ڈسٹرکٹ کونسل کی طرف سے عائد پراپرٹی ٹیکس کو ختم کیا جائے۔

۳۔ سرائے عالمگیر کے علاقہ سے بیروزگاری ختم کرنے کے لئے ملیں اور کارخانے لگائے جائیں۔

۴۔ سرائے عالمگیر کے باثر لوگوں کو پولیس سے ذاتی اغراض حاصل کرنے سے روکا جائے۔

۵۔ کھاریاں میں عصمت فروشی کے اڈے ختم کئے جائیں

۶۔ کھاریاں میں مالکان کو دکانوں کے کرایوں میں ناروا اضافہ کرنے سے روکا جائے۔

۷۔ سرائے عالمگیر سے بھمبر تک کی سڑک کو بہتر بنا کر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کا فوری بندوبست کیا جائے۔

۸۔ سرائے عالمگیر جی ٹی روڈ کے دونوں طرف واقع پٹڑہ پی ڈبلیو ڈی پر دکانیں تعمیر کی جائیں۔

۹۔ موضع دندی نظام کے اسلامی ہائی اسکول کو حکومت کی تحویل میں لیا جائے۔

۱۰۔ ڈھوک امرال میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کا اسٹاپ بنایا جائے۔

۱۱ نہر اپر جہلم سے ملحقہ دیہات کے لوگوں کو محکمہ جنگلات کے کارندوں کی زیادتیوں سے نجات دلائی جائے

۱۲۔ پھالیہ کے پیشہ ور چوروں اور اُن کے سرپرستوں کی سرکوبی کی جائے۔

۱۳۔ ہڑیلہ شریف میں ہائی اور مڈل اسکول قائم کئے جائیں اور موجودہ اسکولوں کے نظام کو ابتری سے پاک کیا جائے

۱۴۔ شادیوال پاور ہاؤس سے سعد اللہ پور تک سڑک تعمیر کی جائے۔

۱۵۔ منڈی بہاؤالدین میں دفتر سیٹلمنٹ کی شاخ قائم کی جائے۔

۱۶۔ پھالیہ کے "رکھ ڈفر" میں چھپے ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے "اسپیشل گارڈ" متعین کی جائے

۱۷۔ پھالیہ قادر آباد روڈ کے نام پر گورنمنٹ کا روپیہ ہضم کرنے والوں کا محاسبہ کیا جائے اور سڑک کی حالت بہتر بنائی جائے۔

۱۸۔ تھانہ قادر آباد میں سڑکیں اور ہائی اسکول بنائے جائیں۔

۱۹۔ میانہ گوندل میں ہائی اسکول قائم کیا جائے۔

۲۰۔ چک نمبر ۲۸ پھالیہ کے پرائمری اسکول کو مڈل کا درجہ دیا جائے۔

۲۱۔ بلدیہ ملک وال کو توڑ دیا جائے۔ مارکیٹ کمیٹی ملکوال کے حالیہ غیر منصفانہ انتخابات کالعدم قرار دیئے جائیں۔

۲۲۔ ملک وال کے قریب گوجرہ، پنڈ دادن خاں روڈ پر منظور شدہ پل فوراً تعمیر کیا جائے۔

۲۳۔ رسول بیراج کے قریب واقع کوٹلی افغاناں کے عوام کی دشواریوں کو دُور کیا جائے۔

۲۴۔ میونسپل کالج منڈی بہاؤالدین کو حکومت کی تحویل میں چلایا جائے۔

طارق جاوید چودھری صدر این ایس ایف ضلع گجرات نے صدرِ پاکستان آغا محمد یحییٰ خاں سے اپیل کی ہے کہ وہ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی صدر، ممتاز طالب علم رہنما رشید حسن خاں اور روزنامہ آزاد کی مجلسِ ادارت کے رکن عبد اللہ ملک کو رہا کر دیں۔ اپیل کا متن یہ ہے:۔

"ہم صدر پاکستان آغا محمد یحییٰ خاں سے طلباء کے عظیم قائد ڈاکٹر رشید حسن خاں مرکزی صدر نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی رہائی کی پُر زور اپیل کرتے ہیں۔ ان حالات میں جب کہ تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں کو بھی رہا کر دیا جائے۔

روزنامہ آزاد کی مجلسِ ادارت کے رکن، ممتاز صحافی اور دانشور عبد اللہ ملک کو بھی ان کی ضعیفی کے پیشِ نظر رہا کیا جائے۔

اس پر مندرجہ ذیل اصحاب کے دستخط موجود ہیں

ایم۔ این۔ اے

مولانا کوثر نیازی (۲) خورشید حسن میر (۳) منظور حسین دودھڑا (۴) چودھری فضل الٰہی (۵) چودھری غلام رسول تارڑ۔ (۶) ڈاکٹر غلام حسین (۷) انور نور

ایم۔ پی۔ اے

۸۔ ممتاز احمد کاہلوں (۹) جاوید حکیم قریشی (۱۰) شیخ محمد انور (۱۱) عبد الغفار خاں (۱۲) بریگیڈیئر صاحبداد۔ (۱۳) ڈاکٹر عبد الخالق (۱۴) چودھری حیات محمد

اس کے علاوہ

۱۔ مزدور رہنما راحت ملک (۲) سرور راٹھور (۳) محمد سرور جوڑا (۳) چودھری غلام فرید ایڈووکیٹ گجرات (۴) ایس ایم سعود ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور (۵) لطیف بھٹی (۷) چودھری افتخار حسین سلیمی (۸) ضمیر حیدر جعفری این ایس ایف گجرات (۹) محمد سلیم جنجوعہ این ایس ایف لالہ موسٰی (۱۰) مشتاق احمد این ایس ایف منڈی بہاؤالدین (۱۱) ظفر الٰہی این ایس ایف کنجاہ ضلع گجرات۔

اس کے علاوہ طارق جاوید چودھری نے متعلقہ حکام سے ایک طلبہ تنظیم کے غنڈوں کے این ایس ایف لالہ موسٰی کے صدر محمد سلیم جنجوعہ پر قاتلانہ حملے کی تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے اور کہا ہے کہ حملہ آوروں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔



قارئین کہتے ہیں



ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے امریکی سامراج کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ دیکھتے مولانا کے مُنہ سے یہ بات کتنی عجیب لگتی ہے۔ اُن کا شمار تو کٹر قسم کے طرفداروں میں ہوتا ہے اور اب جو پلٹا مارا تو بائیں بازو والوں کو سینکڑوں میل پیچھے چھوڑ دیا۔ سوشلسٹ حضرات جو امریکی سامراج کی مخالفت پر اتحارٹی سمجھے جاتے ہیں۔ اب مولانا کے بیان پر انگشت بدنداں ہیں۔ مولانا نے اُن کے کہنے کے لئے کچھ چھوڑا ہی نہیں ہے۔ وہ حیران پریشان ہیں کہ اگر امریکہ کے خلاف کچھ کہنا ہُوا تو بات کہاں سے شروع کریں گے اور کہاں ختم کریں گے۔ سوشلسٹوں نے آج تک یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ پاکستان سے امریکیوں کو نکال دیا جائے۔ مولانا نے یہ مطالبہ بھی پوری شدّ و مد کے ساتھ کر دیا۔ ہمیں مولانا کے دُوسرے بیان کا انتظار رہے گا۔ دیکھئے وہ اپنے پہلے بیان پر کب عمل کرتے ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی خدشہ ہے کہ یہ کوئی نئی چال نہ ہو۔ ورنہ مولانا مودودی اور امریکہ کی مخالفت - ساقی نے یقیناً شراب میں کچھ ملا دیا ہے۔

(سعید احمد خان - راولپنڈی)

مادام نورجہاں شادی کا خیال چھوڑ دیں

مادام نورجہاں کو اب شادی کا خیال ترک کر دینا چاہئے۔ بلاشبہ شادی ایک ضروری اور مقدس فریضہ ہے، مگر ایسا بھی کیا کہ اس فریضے کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا جائے۔ اس عمل کو بار بار دُہرانے سے سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی مادام اس منزل میں داخل ہو چکی ہیں جہاں لفظ شادی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ماشاءاللہ اُن کے بچے جوان ہیں۔ اب انھیں زیب نہیں دے گا کہ وہ پھر بیاہ رچالیں۔ خدا کی دین سے انکار نہیں کر سکتیں۔ عزت، دولت اور شہرت مادام کے پاس کیا نہیں۔

مادام کا اس عمر میں شادی سے پرہیز کرنا یوں بھی ضروری ہے کہ اُن سے بیشمار لوگ شادی کی خواہش رکھتے ہیں۔ اگر انہوں نے کسی ایک سے شادی کر کے اُس کا دل خوش کر دیا تو باقی تمام محروم لوگوں کا دل خون ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ وہ کسی سے شادی نہ کریں اور بقیہ عمر اللہ کی یاد میں بسر کریں۔ حج کو جائیں۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم ہے۔ اُن کے زخم مندمل کر دے گا۔ یہ میری نہیں اُن کے لاکھوں پروانوں کی خواہش ہے۔

(حسام الدین - لاہور)

اس میں بسوں کے مالکان اور کنڈکٹر صاحبان کا بھلا ہو گا

میری ایک تجویز ہے۔ بسوں کی ساری سیٹیں نکلوا دی جائیں۔ اس طرح زیادہ جگہ نکل آئے گی اور سو سوا سَو کھڑے ہُوئے مسافروں کی کینہ پرور نظروں سے پندرہ بیس بیٹھے ہُوئے افراد بچ جائیں گے۔ کبھی کی نیکی کام آئی اور مجھے بس میں جگہ مل گئی۔ ایک صاحب جو میری سیٹ میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ میری پھُرتی کے سبب جگہ حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے۔ موصوف راستہ بھر مجھے گھورتے رہے اور پھر اُن پندرہ بیس سیٹوں سیٹوں سے فائدہ بھی کیا۔ بلاوجہ کھڑے ہونے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ بسوں کے زیادہ تر مسافر تو کھڑے ہو کر ہی سفر کرتے ہیں۔ اگر ساری سیٹیں نکلوا دی جائیں تو سارے مسافر کھڑے ہو کر سفر کریں گے۔ کسی پر کسی کو فوقیت حاصل نہ ہوگی۔ ایک ہی صف میں جھُولا جھُولتے ہُوئے سارے مسافر اپنی منزل کو خیر و عافیت سے پہنچ جائیں گے۔ مالکان کا بھی بھلا ہو گا اور کنڈیکٹر

صاحبان کا بھی جو مسافروں کو آٹے کی بوریوں کی طرح ایک دوسرے پر چڑھا کر رکھنے میں ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ (فیاض الحسن - کراچی)

سندھ کی تہذیب کو فلموں کے ذریعہ عوام میں روشناس کرایا جائے

سندھ کی تہذیب و ثقافت جو صدیوں پرانی ہے اپنے دامن میں بے پناہ وسعت لئے ہوئے ہے۔ وادیٔ مہران کا ذرّہ ذرّہ سندھ کی عظمت کا گواہ ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کا کلام سندھی قوم کو ورثہ میں ملا ہے۔ عرصہ تک یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ سندھ کی عظیم الشان تہذیب کو جدید دور کے اہم وسیلہ فلم کے ذریعہ روشناس کرایا جائے۔ پنجابی اور بنگالی فلموں کے بعد سندھی فلموں کا دور شروع ہوا اور ایک عرصہ کے بعد پہلی سندھی فلم شاہ رو فیروز نمائش کے لئے پیش ہوئی۔ اس فلم نے اگرچہ سندھی زبان بولنے والوں کو زیادہ متاثر تو نہ کیا لیکن کچھ تشنگی ضرور کم ہوئی۔ ان دنوں بڑی تعداد میں سندھی فلمیں زیرِ تکمیل ہیں۔ خدا کرے کہ سندھی فلمساز اپنی تہذیب اور زبان کی حفاظت کے لئے اسی جذبہ اور خلوص سے اپنا مشن جاری رکھیں جس کا مظاہرہ اُنہوں نے پہلے کیا ہے۔

(تنویر واسطی، کراچی)

بقیہ: زندگی اے زندگی

اس کی تنخواہ ۱۷۵ روپے بنتی ہے۔ سال میں ۵ روپے کا انکریمنٹ ملتا ہے۔ اُس کے خاندان میں بیوی اور بچے ملا کر کل پانچ افراد ہیں۔ ایک بچی تیسری کلاس میں پڑھتی ہے۔ اور ایک چھوٹا بچہ دوسری کلاس میں زیرِ تعلیم ہے۔ اُس نے اپنے اخراجات کا جو بجٹ بتایا وہ نیچے درج ہے۔

آٹا (کبھی کبھی چاول)	۳۷ روپے
شکر	۱۵ روپے
مٹی کا تیل	۱۵ روپے
گھی ڈالڈا	۱۰ روپے ۵۰ پیسے
تیل (کھانے والا)	۱۱ روپے
صابن (نہانے اور دھونے کیلئے)	۷ روپے
مصالحہ	۵ روپے
دال	۵ روپے
دودھ	۱۸ روپے
کپڑے کی دھلائی	۱۲ روپے
چائے	۸ روپے
دو بچوں کی فیس	۸ روپے
بس کا کرایہ	۲۰ روپے
علاج و معالجہ	۱۰ روپے
میزان:-	۱۸۱ - ۵۰ روپے

کلرک انور سعید نے بتایا کہ آپ اس بجٹ کی روشنی میں ہماری مشکلات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ شادی، بیاہ، تہوار اور مہمانوں کی آمد کا سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے۔ ان پر الگ سے اخراجات آتے ہیں۔ اس کے علاوہ سال بھر میں اگر دو بار نہیں تو ایک بار ضرور سب کے کپڑے سلوانے ہوتے ہیں۔ ان تمام بنیادی اخراجات کو سامنے رکھ کر کلرک کمیونٹی کی پریشانیوں کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ سال میں دو تین بار اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جن کے پاس آمدنی کے وسائل اور ذرائع ہیں اُن کے لئے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں مگر ہمارے جیسے لوگوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ لگی بندھی آمدنی میں گھر کا خرچ چلانا آسان کام نہیں۔ ہر ماہ مر کر زندہ ہونا پڑتا ہے۔ سفید پوشی الگ جان کے لئے مصیبت بنی ہوئی ہے۔ کالج کے زمانے میں کبھی کبھار سینما دیکھ لیا کرتا تھا، اب تو یہ سستی تفریح بھی ایک بڑی عیاشی بن گئی ہے۔ میرے بجٹ میں آپ کو سبزی، گوشت اور پھل فروٹ کا نشان نہیں ملے گا، سگریٹ، پان، جوتے اور اُن کی مرمت، بجلی کا بل، پانی کا خرچ، مکان کا کرایہ اس بجٹ کے علاوہ ہے، یہ خرچ کیسے پورا ہوتا ہے، نہیں بھیا پورا کہاں ہوتا ہے، یوں سمجھ لیں ہر روز روزِ مرگ ہے اور ہر رات شبِ موت۔ زندگی ہے مگر موت سے بدتر۔ بچے زیادہ تنگ کرتے ہیں تو انہیں کسی پارک کی مفت تفریح کرا کے خوش کر دیتا ہوں۔ خدا معلوم آئندہ زندگی کس طرح کٹے گی"۔

الفتح

قارئین کرام



کو حسب وعدہ شاندار بنانے کیلئے
ہم نے ایک ممتاز سیاسی رہنما،
کی ایک اہم **خُفیہ فائل** بھی
اُڑانے کی جرأت کرلی ہے۔



چند ایجنٹ حضرات نے ابھی مطلوبہ تعداد سے آگاہ نہیں کیا، وہ فوری طور پر رابطہ قائم کریں۔

جنرل مینجر ہفت روزہ الفتح - ۱۰ - ڈی - کمرشل ایریا - پی - ای - سی - ایچ - ایس - نرسری - کراچی

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
24, JUNN – 1st JULY, 1971